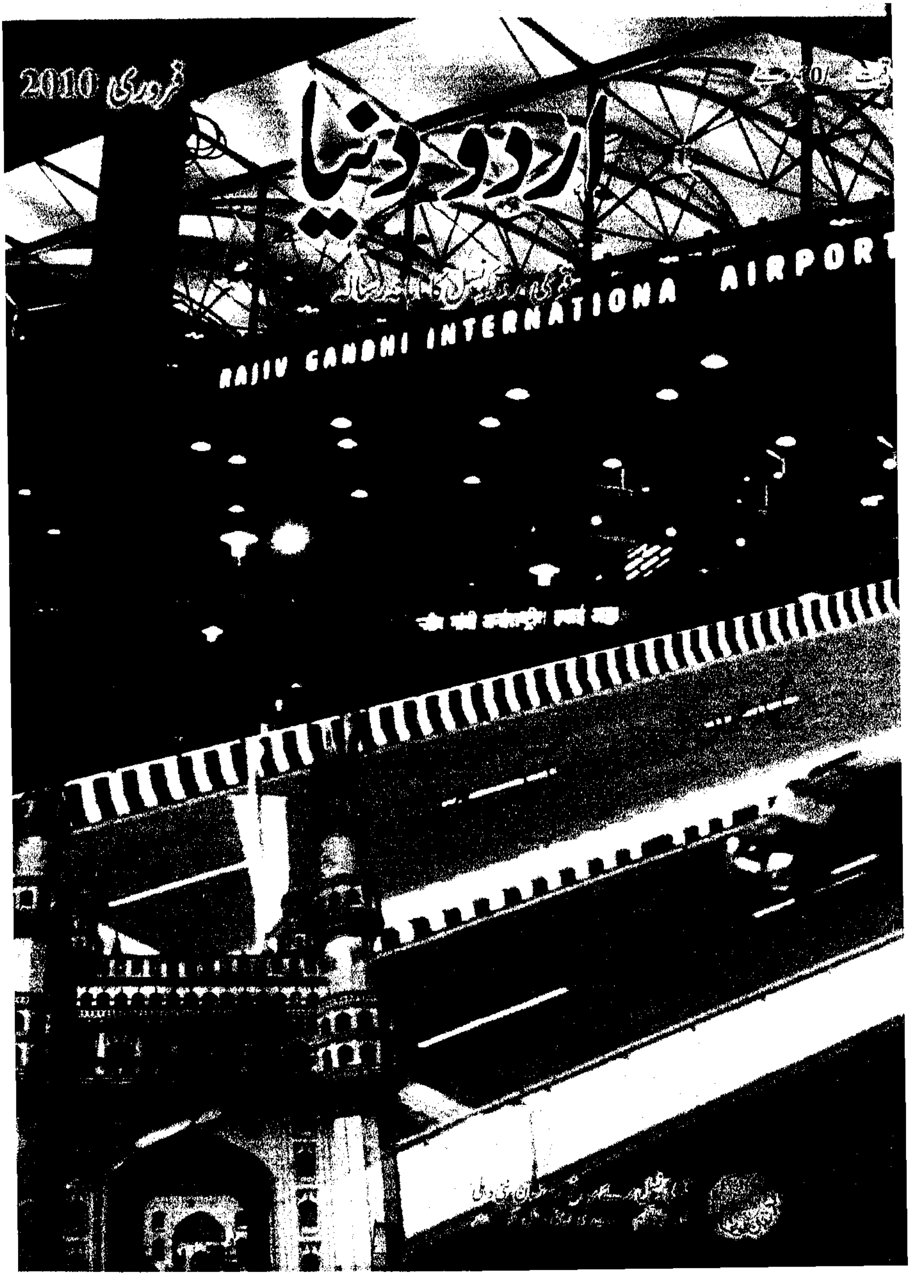

فروری 2010
اردو دنیا
RAJIV GANDHI INTERNATIONA AIRPORT

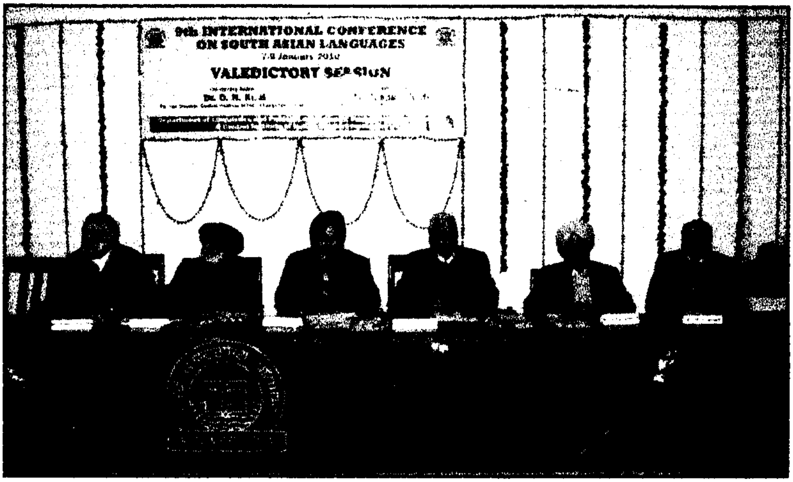

7-9 جنوری 2010 کو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز میسور کے اشتراک سے پٹیالہ میں جنوب ایشیائی زبانوں پر نویں بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں پندرہ ملکوں کے تقریباً 300 ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ کانفرنس کی تفصیلات ''اردو دنیا'' کے اگلے شمارے میں ملاحظہ کریں۔
تصویر میں ڈاکٹر بورس ذخارین، ڈاکٹر ستندر سنگھ نور، ڈاکٹر جلکپال سنگھ، ڈاکٹر او. این. کول، ڈاکٹر جوگا سنگھ اور ڈاکٹر آر. کے. بھٹ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

بین الاقوامی غالب سیمینار کے موقع پر غالب انعامات برائے 2009 کی تقریب تقسیم بھی منعقد ہوئی۔ تصویر میں (بیٹھے ہوئے، دائیں سے) خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر مبارک علی، جناب امیر حسن عابدی، دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب تیجندر کھنہ، جناب محمد شفیع قریشی اور پروفیسر ہربنس مکھیا۔
کھڑے ہوئے (دائیں سے) پروفیسر اختر مہدی، مخمور سعیدی، پروفیسر انصار اللہ، پروفیسر عبدالستار دلوی، جناب نند کشور وکرم اور جناب حسن کمال جنھیں بالترتیب فارسی تحقیق وتنقید، اردو شاعری، اردو نثر، مجموعی اردو خدمات اور اردو ڈراما/صحافت پر ایوارڈ پیش کیے گئے۔

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد-12، شمارہ-2، فروری 2010

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون:26103938, 26103381
فیکس:26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون:26169416, 26109746

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات ..... ادارہ 8

زبان، ادب اور تعلیم

● اردو فکشن میں ٹریجڈی کا جمال — سعادت حسن منٹو کے حوالے سے ..... شکیل الرحمٰن 9
● وہابی تحریک اور اردو ..... سکندر احمد 12
● اقبال کی نظم "بزم انجم" کا تجزیہ ..... محمد افضل ملک 16
● اردو — اکیسویں صدی میں ..... محمد شجاعت علی راشد 18
● اردو زبان — نئے افق ..... سلیمان اطہر جاوید 20
● زبان و ادب کی تدریس کے مسائل ..... آفاق عالم صدیقی 23

کلاسیکی ادب

● پھول بن ..... ابن نشاطی 26
● دو غزلیں ..... شاہ نجم الدین مبارک آبرو 31

ماحولیات

● عالمی ماحولیاتی کانفرنس ..... صفی اختر 32
● موسم، آب و ہوا اور فضا کی بہتری کے لیے ..... مجیب الرحمٰن 35
● ہمالیہ کا لاڈلا ..... مندیپ سنگھ سوئن 37

کیریئر

● جیولوجی میں کیریئر ..... وویک کمار سنگھ اور وجے سنگھ 39

ہماری مطبوعات سے

● عصر ماقبل کی تاریخ اور حیات قدیمہ ..... ڈی. ڈی. کوسمبی/ بالمکند عرش ملسیانی 41
● 1857 اور ہندی ادب ..... پی. سی. گپتا 45

اردو خبرنامہ ..... ادارہ 50
تبصرہ و تعارف 68

● قطب مشتری ..... عبدالسمیع
● دل کی گیتا ..... غافل انصاری
● دنیا میں ایڈس ..... جعفر محمود
● ہند و پاک کی خواتین ناول نگار ..... عبدالرب
● الفاظ کی دنیا ..... خالد سعید
● شکستہ خاطر ..... زبیر شاداب
● دیگر کتب ..... ادارہ

بچوں کا گوشہ

● آخری عنایت ..... عظیم اقبال 75
● نظمیں ..... محمد افضل خاں 77

آپ کی بات

■ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، فرحت منزل، کالی پلٹن، نزد دیوان جی کنواں، ٹونک (راجستھان)-304001

''اردو دنیا'' شمارہ 12، دسمبر 2009، موصول ہوا۔ ''انگریزی نظام تعلیم میں اردو نصاب کا مسئلہ'' اس موضوع پر اطہر فاروقی صاحب نے فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے انگریزی اور اردو نصاب کا موازنہ کرتے ہوئے اردو کے کم معیار اور فہم و ادراک کی کمی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ایک توجہ طلب امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو ادارے جن سے بھی نصاب بنواتے ہیں وہ بچوں کی نفسیات اور ادراک سے انصاف نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا رجحان اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کی نفسیات کے اردگرد گھومتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کی نفسیات سے جُڑے ماہر اساتذہ کا انتخاب کتابیں لکھنے کے لیے کیا جائے۔ NCPUL اور دیگر اداروں کے ذمے دار ایسے اردو اساتذہ اور اردو مصنفین کی پہچان کر کے، انھیں نصابی کتابیں لکھنے کے مواقع دیں۔ صوبائی اور مرکزی سطح پر مصنفین کو مدعو کریں۔ ان کے ورک شاپ کریں۔ نصاب کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کریں، تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے تبھی پورے ملک میں یکساں نصاب صوبوں کی ضرورتوں اور ان کے مطابق تیار ہو سکے گا۔ NCPUL اس میں اہم رول ادا کرسکتا ہے۔

اسی شمارے میں ''رسم اجرا'' کے تحت ڈاکٹر پریتی شرما کی اہم تاریخی کتاب ''بیگم سمرو'' حیات اور ان کی وراثت کے اجرا کی رپورٹ پڑھی۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ٹونک میں بھی 1843 فارسی کا ایک نایاب منظوم مخطوطہ بعنوان ''زیب التواریخ'' مصنف، گوکل چند موجود ہے جس میں چند تاریخی تصاویر بھی ہیں۔ اس مخطوطے کے مطابق زیب النسا بیگم عرف بیگم سمرو، والٹررین ہارڈ عرف سمرو (جرمن) کی بیوی تھی۔ ابتدا میں یہ سوانح عمری زیب النسا کی فرمائش پر منشی جے سنگھ نے نثر میں لکھی تھی اور اس کو لندن بھیج دیا گیا تھا لیکن وہ کسی صورت ضائع ہوگئی اور اسی دوران اس مصنف کا انتقال ہوگیا۔ اس واقعے کی دس سال بعد گوکل چند نے سوانح عمری کو نظم میں لکھا۔ اس فارسی مخطوطے کا اردو نثر میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے۔ ''راجستھان میں اردو تراجم'' از ڈاکٹر عزیز اللہ شیدائی)۔

■ تمنا مظفر پوری، ''سمن زار ادب''، جمیل کمپاؤنڈ، سمن پورا، پٹنہ-14

''اردو دنیا'' بابت ماہ دسمبر 2009 زیر مطالعہ ہے یوں تو اس میں تمام مشمولات اپنی جگہ قابل مطالعہ ہیں لیکن جناب یعقوب یاور کا مضمون ''سرسید احمد خاں اور بنارس'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔ سرسید احمد خاں کے متعلق نئی معلومات حاصل ہوئیں۔

بچوں کا گوشہ ایک اچھا سلسلہ ہے مگر اس کی ضخامت بڑھا دیں تاکہ جس گھر میں اردو دنیا جائے وہاں کے بچوں کو مطالعے کے لیے اور بھی زیادہ مواد ملے۔ بس ایک کہانی سے تشنگی دور نہیں ہوتی۔ کم از کم آٹھ دس صفحات بچوں کے لیے مخصوص کر دیں تاکہ ''اردو دنیا'' کے مطالعے میں وہ دلچسپی لیں اور ان کی عادت اردو رسالوں کے مطالعے کی پڑ جائے۔ آخر یہی بچے تو مستقبل کے اردو زبان کے قاری ہوں گے۔

ادارہ اس سلسلے میں اپنے قارئین کی رائے جاننا چاہے گا۔ اگر دوسرے قارئین نے بھی یہ خواہش کی تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

ادارہ

■ محمد ناظم علی، صدر شعبہ اردو گری راج کالج، نظام آباد، (اے۔ پی۔)-02

دسمبر 2009 کا ''اردو دنیا'' وقت پر موصول ہوا۔ آپ کی بات کالم کے تمام خطوط پڑھے ان خطوط میں رسالے میں شامل نگارشات پر تبصرہ منصفانہ ہے۔ اس کالم کو جاری رہنا چاہیے تاکہ رسالے کے معیار پر روشنی پڑتی رہے۔ اداریہ ''ہماری بات'' میں جناب کپل سبل کی تقریر حوالہ ہے جس میں انھوں نے مولانا آزاد کی تعلیمی خدمات کو سراہا ہے اور ان کی سیرت و شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ غلام نبی آزاد نے بھی مولانا کی صحافتی و تعلیمی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے اصل ذمے دار اردو والے ہیں۔ کوئی تو اردو کے تعلق سے سنجیدہ ہو۔ یعقوب یاور نے سید احمد خاں اور بنارس پر معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ اطہر فاروقی نے اردو تعلیم و اردو نصاب کے مسائل پیش کرتے ہوئے اردو کے تدریسی حالات پر فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ خالد محمود نے اردو میں ترجمہ نگاری پر اچھا مضمون لکھا ہے اور ترجمے کے فن پر جامع گفتگو کی ہے ویسے ترجمہ مشکل فن ہے اصل کو ترجمے کے ذریعے سے ہو بہو منتقل کرنا ناممکن ہے انھوں نے لکھا ہے کہ ترجمے کی ایک لازمی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ مترجم اس موضوع اور زبان دونوں سے پوری واقفیت ہونی چاہیے۔ مختلف کتابوں خصوصاً نصابی کتب کے تراجم دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مترجمین زبانوں پر عبور نہیں رکھتے یہ افسوسناک صورت حال ہے۔ مترجم کا دونوں زبانوں کی روایات مزاج اور لسانی خصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہے سرورالہدیٰ نے خلیل الرحمن اعظمی کے تبصروں کے حوالے سے ان کے نظریۂ

تنقید سے اچھی بحث کی ہے نشاط فاطمہ نے وامق جونپوری کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے کلام کے حسن و قبح کو پیش کیا ہے۔ فیاض رفعت نے محمود ہاشمی کی یاد میں اردو کی ترقی پسند تحریک اور جدیدیت سے متعلق بحث چھیڑ دی۔ نئے حقائق معلوم ہوئے۔ اقبال محی الدین نے روایتی اور غیر روایتی توانائی سے متعلق معلومات فراہم کی ہے۔ آج کل کچرے سے بھی توانائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ توانائی کے وسیلے بہت ہیں لیکن ان وسائل سے استفادہ کرنے کے لیے ٹیکنالوجی درکار ہے۔ اردو خبرنامہ اردو دنیا کی سرگرمیوں پر محیط ہے ملک و بیرون میں کیا ہو رہا ہے اس کی تفصیلات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ یہ کالم نہ صرف معلومات بلکہ ادبی فکر و آگہی بھی عطا کرتا ہے۔ تبصرہ و تعارف معیاری جامع تبصرے شائع ہو رہے ہیں۔

■ **ایم۔ راگھوراؤ، ساؤتھ سول لائنز، چھندواڑا-480001، مدھیہ پردیش**

نومبر 2009 کا شمارہ پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تمام مشمولات پسند آئے۔ رسالہ ادبی اور علمی غذا کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور سائنسی علوم و فنون کے نت نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرانے لگا ہے۔ خبریں اور تبصرے ہماری بصیرت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ''آپ کی بات'' کالم کے تحت جو خطوط شائع ہوتے ہیں ان سے رسالے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شعیب اعظمی کا مضمون ''نہرو اور آزاد کے تعلقات'' تاریخی دستاویز ہے۔ آج اگر ملک کی آدھی سے زیادہ عورتیں تعلیم یافتہ ہو چکی ہیں تو اس کے پیچھے مولانا آزاد کی دانش ورانہ قیادت کا ہاتھ ہے۔ سیدہ جعفر نے احمد فراز پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے فراز نے انسانی تجربے کی کسک کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے، ان کی غزلیں ان کی ہنرمندی کا احساس دلاتی ہیں۔ فراز محبت کو زندگی کا اہم مقصد قرار دیتے ہیں، ان کی شاعری میں غم، محبت اور عصری آگہی تینوں عناصر چمک اٹھے ہیں۔ اسد رضا صاحب کا سفرنامہ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ سنہرے ماضی کی یادگار جمنا داس اختر کے متعلق بھرپور جانکاری دینے کے لیے فاروق ارگلی صاحب کا شکریہ۔ جمنا داس اختر نے نہ صرف جنگ آزادی کے زمانے میں ایک سچے وطن پرست کا کردار ادا کیا بلکہ آزادی کے بعد ایک بے باک صحافی کے طور پر وطن کی خدمت کی۔ مرزا دبیر پر مضمون بے حد پسند آیا، مرزا دبیر نے اپنی صلاحیتوں سے اردو زبان کو مالا مال کر دیا، اردو کو اس قابل بنایا کہ اس کا قد فارسی کے برابر نظر آنے لگا۔ مرزا صاحب نے صنف مرثیہ کی آبیاری کی اور مرثیہ کی نئی روایت قائم کی۔

اخروٹ کی میٹھی روٹی، لذیذ تگی اور ملّا نصرالدین کے لطیفوں نے خوب گدگدایا۔ دسمبر کا شمارہ بھی باصرنواز ہوا۔ اس کی آب و تاب نظروں کو خیرہ کر رہی ہے۔ آپ جو ''ہماری بات'' عنوان سے لکھتے ہیں اسے میں غور سے پڑھتا ہوں۔

ہندوستان کا تعلیمی نظام دو زمروں میں تقسیم ہے جو آج بھی ہمارے سماج کو طبقوں میں بانٹتا ہے۔ اردو میں اچھی کتابیں فراہم کرنا ضروری ہے۔ جنھیں ترجمہ کرنا نہیں آتا وہ بے جھجک ترجمہ کرتے رہتے ہیں، خالد محمود کے پیش کردہ ترجمہ نگاری کے اصول قابل قدر ہیں۔ فیاض رفعت نے صحیح فرمایا کہ محمود ہاشمی اتنے سخن پرور تھے کہ ان کے لفظوں کی خوشبو دل میں اتر جاتی ہے۔

نئے پیشہ ورانہ کورسیز میں کیریئر کی جانکاری کے لیے فاروق احمد صاحب کا شکریہ۔

توانائی کے ذخائر بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر روایتی توانائی استعمال میں لائی جائے۔ سورج کی دھوپ اپنے آپ میں آلودگی سے پاک ہے اور سب کو آسانی سے میسر ہے۔ خبرنامے میں اردو کے متعلق سبھی اہم خبریں سمٹ گئیں ہیں۔

■ **ڈاکٹر ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی**

آپ قابل صد تہنیت و مبارک باد ہیں کہ آپ کے موقر مجلے میں بصیرت افروز اور معلوماتی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں چنانچہ نومبر 2009 کے شمارے میں ''نہرو اور آزاد کے تعلقات''، ''چکبست کا قائم کردہ کشمیری کلب''، ''اردو شاعری اور طب'' اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ اسی طرح اس شمارے میں کلاسیکی ادب کا شاہ کار ''نصوح کا خواب'' بھی شائع ہوا ہے۔ اردو کے مشہور اور معروف صحافی جمنا داس اختر صاحب پر جناب فاروق ارگلی کا پراثر مضمون بھی اس ذیل میں آتا ہے۔

■ **ڈاکٹر حیات افتخار، نمبر80#، (اولڈ 213/1#) چولائی میڈو ہائی روڈ، چولائی میڈو، چنئی-600094**

شمارہ بابت نومبر 2009 نظرنواز ہوا۔ اس کے تمام مشمولات قابل مطالعہ ہیں۔ آپ نے کلاسیکی ادب، سفرنامہ اور رفتگاں کے تحت جو مضامین شائع کیے ہیں وہ آپ کے حسن انتخاب کی دلیل ہیں۔ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق رسالہ ''اسپین'' سے ماخوذ مضمون وہاں پر اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے کا ارادہ رکھنے والوں کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ مرزا محمد زماں آزردہ کا مرزا دبیر پر مضمون مطالعۂ دبیر میں ایک اہم اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ کی ادارت میں نکلنے والا یہ رسالہ ساری اردو دنیا کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

آپ کا ماہنامہ اور ادارہ دونوں تمام علاقائی تعصبات سے بالاتر ہو کر اردو زبان و ادب کے فروغ میں خلوصِ دل سے کوشاں ہیں اس کے لیے آپ اور آپ کی ٹیم دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■ ع.ق. صابر بیلوی ایم.اے.، الطاف نگر، نزد سرکاری اردو اسکول، جونی ہُبلی، ہُبلی-24 (کرناٹک)

ماہنامہ ''اردو دنیا'' دہلی، نومبر 2009 کا شمارہ مقامی کتب فروش سے دستیاب ہوا۔ اندرونی صفحات کے مطالعے سے قبل مجھے سرورق پر معروف سیاسی رہنماؤں کی خوبصورت تصویریں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اندرونی صفحات کا مطالعہ شروع کیا تو میری دلچسپی بڑھتی ہی گئی اور مکمل مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بلامبالغہ رسالہ علمیت، ادبیت، مقصدیت اور جامع معنویت سے معمور ہے۔

''اردو خبرنامہ'' جو ساڑھے گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ عمدہ معلومات سے ہمکنار کرتا ہے محترم فاروق ارگلی کا مقالہ ''جمنا داس اختر'' پر بڑا معلوماتی ہے۔ معروف قلمکار کی اردو زبان کی 27 تصانیف اور انگریزی زبان کی پانچ تصنیفات سے آگاہی ہوتی ہے۔ محترم اسد رضا کا مضمون ''انگلینڈ کا سفر بھی رہا باعثِ ظفر'' ہمیں لندن، برمنگھم، انگلینڈ ہالینڈ، کینڈا کے مناظر اور مختلف لذیذ کھانوں کے احوال سے لطف اندوز کراتا ہے۔ اور بعض ایمان شکن افعال و اعمال جو مغرب میں رائج ہیں ان سے بھی آشنا کراتا ہے۔ دلچسپی ابتدا سے اختتام تک برقرار رہتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد ہمارے کلاسیکی ادب کا ستون ہیں ''نصوح کا خواب'' کے عنوان سے ان کی جو تحریر نقل کی گئی ہے۔ اس میں باپ اور بیٹے میں مکالماتی گفت وشنید مؤثر ہے انداز تحریر نہایت ہی حسین ہے۔ محترم نجے کمار کا مضمون ''چکبست کا قائم کردہ کشمیری کلب'' اور محترمہ سیّدہ جعفر کا مضمون ''محبت کا مغنی احمد فراز'' بھی جاندار اور جاذبیت سے معمور ہیں۔ تیرہ شعری مجموعوں کے خالق احمد فراز نے اپنی زندگی ہی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔ محترم منی بھوشن کمار کا مضمون ''مولانا آزاد کی نگاہ میں عورتوں کا مقام'' بھی نہایت ہی عمدہ ہے اور تعمیری و اصلاحی پہلو سے مزین ہے۔ ''نہرو اور آزاد کے تعلقات'' بھی قابلِ ستائش اور لائقِ تحسین ہے۔ تمام قلمکاروں کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد کا نذرانہ پیش کرتا ہوں ''اردو دنیا'' کو پروان چڑھانے میں مدیر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور اعزازی مدیر مخمور سعیدی صاحبان کی کاوشوں کو بھی کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

■ نفیس احمد عبدالحکیم، شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہٰ آباد

سب سے پہلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے متعلقین خصوصاً ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے کتابوں کی موبائل وین الہٰ آباد یونیورسٹی میں بھیج کر ہم جیسے طلبہ کو کتابیں فراہم کرائیں۔

''اردو دنیا'' نومبر 2009 کا شمارہ ملا پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی اداریہ، شعیب اعظمی کا مضمون ''نہرو اور آزاد کے تعلقات''، منی بھوشن کمار کا مضمون ''مولانا آزاد کی نگاہ میں عورتوں کا مقام'' تقاضائے حال کے مطابق ہیں 11 نومبر کو مولانا آزاد کے یوم ولادت کو ہم بطور یوم تعلیم مناتے ہیں اسی مناسبت سے ہماری یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی یوم تعلیم منایا گیا اور ایک نشست بھی منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر عبدالقادر جعفری صدر شعبہ عربی و فارسی نے کی پروفیسر علی احمد فاطمی صدر شعبہ اردو نے مولانا آزاد کی تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی نیز ان کے سیاسی و سماجی کاموں کا بھی ذکر کیا اس کے بعد پروفیسر عبدالحامد نے مولانا کی تحریروں اور تصنیفوں کے حوالے سے تقریر کی۔

شعیب اعظمی نے اپنے مضمون ''نہرو اور آزاد کے تعلقات'' میں مولانا اور نہرو کی زندگی کے ہر گوشے کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے جس سے دونوں کی شخصیت اور دونوں کو ایک دوسرے سے کس درجہ تعلق خاطر تھا واضح ہوجاتا ہے۔ منی بھوشن کا مضمون ''مولانا آزاد کی نگاہ میں عورتوں کا مقام'' بھی کافی معیاری ہے جس میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مولانا کا نظریہ پیش کیا ہے۔ فاروق ارگلی کتابوں کے اوراق میں گم ادبا و شعرا کو نئی نسل سے متعارف کرانے کا جو کام کر رہے ہیں یقیناً قابل ستائش ہے اور اسی سلسلے کی اہم کڑی ان کا مضمون ''جمنا داس اختر'' ہے دیگر مضامین اور تبصرے بھی کافی معلوماتی ہیں۔

■ نذیر احمد یوسفی، اردو بازار، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول (بنگال)

''اردو دنیا'' اکتوبر 9 کے شمارے میں مضامین ٹیکنیکل رائٹنگ کی ضرورت وافادیت (محمد اعجاز) زراعت میں جینٹکس کی اہمیت (اقبال محی الدین) مغربی بنگال میں اردو، (پروفیسر شاہد اختر) نئے تعلیمی نظام کی ضرورت (کے این پانکر) او رمہاراشٹر میں اردو کی تعلیم (محمد حسن فاروقی) نہایت معلوماتی اور اہمیت کے حامل ہیں، مضمون نگاروں نے تعلیمی، علمی اور لسانی توسیع کا جائزہ پوری وسعتِ نگاہ سے لیا ہے۔

پروفیسر شاہد اختر نے پتہ نہیں کیوں اپنے مضمون کا عنوان مغربی بنگال میں اردو رکھا ہے، جب کہ مغربی بنگال میں اردو کی تعلیم یا اقلیتی درس گاہیں ہونا چاہیے۔

ادب اور ادیب کے صفحے میں ظفر احمد نظامی اور ابوالمجاہد زاہد کے فن و ہنر کی تعریف گوکہ مختصر ہے لیکن تسلی بخش ہے۔

■ فیروز، ولیج آفس کے قریب پناراِئی پوسٹ، کنور ضلع، کیرالہ

ماہ نامہ ''ارددو دنیا'' ہر ماہ ملتا ہے اور بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اب یہ میرا پسندیدہ رسالہ بن گیا ہے ''اردو دنیا'' کی جو خصوصیت اسے دیگر رسائل سے ممتاز کرتی ہے وہ مضامین کی رنگارنگی اور تنوع ہے۔ ہر مضمون دوسرے سے مختلف بھی ہے اور دلچسپ و متنوع و علم افزا بھی ہے۔ خوش ہوں کہ آپ نے کلاسیکی ادب کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سے بیشک اردو داں طبقہ اردو کلاسیکی

ادب سے روشناس ہوگا۔

شمارۂ اکتوبر کے تمام مضامین بے حد پسند آئے۔ خصوصاً ''زبان و تعلیم'' اور ''ادب و صحافت'' کے تمام مضامین کے. وی. بکولن کے مضمون ''تمل ناڈو میں اہلِ قلم خواتین'' سے تمل ناڈو کی اہلِ قلم خواتین کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں خواتین کا بھی اہم حصہ ہے۔ اظہر راہی کا مضمون ''اردو حروف تہجی کی تعداد'' دلچسپ بھی ہے اور غور طلب بھی۔ یہ سچ ہے کہ اردو حروف تہجی کی تعداد پر ہمارے علما ناحق اختلاف کرتے ہیں۔ میں اظہر راہی صاحب سے اتفاق کرتا ہوں کہ اردو کے حروف تہجی کی تعداد اڑتیس ہے اور اس پر سب کو متفق ہونا چاہیے۔

''آپ کی بات'' میں جناب ڈاکٹر کے. وی. بکولن کا خط پڑھا۔ انھوں نے جو کچھ کیرالہ میں اردو سے متعلق لکھا وہ صحیح ہے۔ کیرالہ میں بھی بہت سے اردو مراکز ہیں ان میں اُپلا، کالی کٹ اور ملاپورم اہم مقامات ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ ان مقامات پر اردو میلے اور دیگر فروغ اردو کے پروگراموں کا انعقاد کریں۔

خصوصاً اُپلا پر آپ کی نظر خاص ہونی چاہیے کیوں کہ اُپلا کیرالہ کا واحد شہر ہے جہاں بڑی تعداد میں اہلِ اردو آباد ہیں۔

■ ڈاکٹر ایس. اے. ایچ. رضوی، سی. ایم. پی. ڈگری کالج،
(یونیورسٹی آف الٰہ آباد)، الٰہ آباد-211002

''اردو دنیا'' کا شمارہ اکتوبر 2009 زیرِ نظر ہے۔ اردو دنیا کا یہ بے حد مقبول جریدہ اپنے متنوع اور کمپوزنگ کی غلطیوں سے پاک مضامین کی بدولت روز بروز اپنی مقبولیت بڑھاتا جا رہا ہے۔ اس شمارے کے تمام مشمولات معیاری اور تازہ کاری کا نمونہ ہیں۔ خاص طور سے اداریہ جامع اور پُر اثر ہے اور اردو خبرنامہ معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ خیال صاحب کے تازہ ترین شعری مجموعے ''صبح مشرق کی اذاں'' پر مخمور سعیدی کا تبصرہ قابلِ ستائش ہیں۔

■ سید عبدالباری آمبوری، نیو نمبر-26، پرانا نمبر-37،
معروف صاحب اسٹریٹ فرسٹ فلور، ہیلیس روڈ، ماؤنٹ روڈ، چنئی

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' بابت اکتوبر 2009 کے صفحہ 20 پر مقالہ ''تمل ناڈو کی اہلِ قلم خواتین'' شائع ہوا ہے۔ بہت ہی خوب ہے۔ اس ضمن میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ چند برس پیشتر غالباً 2000 میں علیم صبا نویدی صاحب کی ایک کتاب ''تمل ناڈو کی خواتین کے ادبی و علمی کارنامے'' کچھ ایسی ہی سرخی رہی ہوگی شائع ہوئی تھی جس میں موصوف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ تقریباً تین یا چار صدیوں کا احاطہ فرمایا تھا۔ مذکورہ مقالے میں جگہ جگہ اس کتاب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، ایسا ہم نے محسوس کیا ہے۔ اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ اگر مضمون نگار اس تصنیف سے استفادہ فرمایا ہے تو اس کا حوالہ دے سکتے تھے۔ یہ ایک احسن بات ہوتی، ورنہ ناقدین ادب آپ پر سرقے کا الزام لگانے میں حق بجانب ہوں گے، بزرگوں سے ہم نے سنا ہے کہ ماہ نامہ ''نگار'' کے مدیر محترم نیاز فتح پوری اس فن کے یعنی سرقہ کے ماہر مانے جاتے تھے اور اسی بنا پر اچھے خاصے بدنام بھی تھے۔ ادب سے نابلد جاہلِ مطلق کی اس تحریر میں اگر دل شکنی یا دکھ کا شائبہ بھی محسوس فرمائیں تو بلا مشروط دست بدستہ درگزر و معافی کا خواستگار ہوں۔

■ ڈاکٹر ظہیر آفاق، اولڈ نمبر 257/1، نیا نمبر-24، پیٹرس روڈ،
گراؤنڈ فلور، رویا پیٹھا، چنئی-600014 (مدراس)

''اردو دنیا'' کا ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ، جناب خالد مسعود نے ''اردو اور اردو والوں کی ذمے داریاں'' میں بجا کہا کہ زبانیں صرف حکومتوں کے بل پر زندہ نہیں رہتیں۔ سرکاری سرپرستی سے ان کی ترقی کی رفتار میں تیزی ضرور آجاتی ہے۔ لیکن اردو بولنے والے ہی اردو کی ترقی کے اصل ضامن ہیں اور وہی اس حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔'' میں مضمون نگار کے گراں قدر تاثرات سے سو فیصد متفق ہوں۔ جناب فیروز بخت احمد کی تخلیق ''زلیخا بیگم کی قبر'' ایک جگر سوز پیش کش ہے۔ ''اردو خبرنامہ'' کے زیرِ عنوان۔ ''زبان سے محبت کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔'' حقیقت ہے سرکار کی بے حسی کا ماتم کرنے کے بجائے اردو والوں کو خود جد و جہد کرنی چاہیے۔ جناب کفیل احمد انصاری نے اسکولوں کے تعلق سے دہلی سرکار کی سرد مہری پر تنقید کی ہے۔ ان کی تنقید اپنی جگہ ہے لیکن انعامات سے نوازے جانے سے اردو کی ترقی پر کوئی خاص اثر پڑنے والا نہیں۔

تبصرہ و تعارف کے کالم میں جناب عبید قمر کے افسانوں کے مجموعے ''تنگی آوازوں کی گونج'' پر جناب فخر الدین عارفی کا تبصرہ قابلِ داد ہے۔ ان کے افسانے اپنے زمانے کی بھرپور مرقع نگاری کا عکس ہیں۔ دو سال پہلے ان سے مدراس میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مدراس کی اردو ادبی سرگرمیوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ پروفیسر حیرت فرخ آبادی کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ حیرت صاحب مزاجاً روایت پسند ہیں، قومی یکجہتی اور سیکولرزم کے علمبردار ہیں۔ مدراس میں 26 ستمبر 2009 کی شام اردو رابطہ کمیٹی کے زیرِ اہتمام قومی یکجہتی کے عنوان پر مشاعرہ منعقد ہوا۔ وہاں حیرت صاحب سے بحیثیت مہمانِ خصوصی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ''نوائے سازِ دل'' ضیا بار کیا۔

■ خورشید کاظمی، 338، دلپتیاں، جموں-180001

ستمبر 2009 کے شمارے میں احسان حسن کا مضمون ''اردو میں پی. ایچ. ڈی. تحقیق کے مسائل'' حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ دیکھ کر انتہائی دُکھ اور افسوس ہوتا ہے کہ وہ جو صحیح لفظ زبان سے ادا نہیں کر سکتے، وہ جن کے ایک

پیراگراف میں کئی غلطیاں ہوتی ہیں آج کل پی. ایچ. ڈی. کی ڈگریاں لیے اردو ادب کے ڈاکٹر بنے پھرتے ہیں۔ جو خود جہل مرکب ہیں وہ بھلا طلبہ کو کیا پڑھائیں گے۔ میں مضمون نگار سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ ایم.فل. اور پی. ایچ. ڈی. کی کھلے عام ڈگریاں عطا نہ کی جائیں اور نگراں حضرات پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے فرض کی انجام دہی کریں۔ لیکن کیا یہ آج کے بگڑے ہوئے تعلیمی اور سیاسی ماحول میں ممکن ہے؟

■ عابد صدیقی جرنلسٹ، سابق نیوز ایڈیٹر دوردرشن، حیدرآباد،

13-6-437/G/A کھیدر باغ، حیدرآباد-500008 (اے. پی.)

قومی کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے آپ کی واپسی اردو والوں کے لیے فال نیک ہے اس موقع پر مجروح کا شعر نذر خدمت ہے:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

آپ کے عزائم اور جرأت رندانہ کا معترف ہوں انشاء اللہ اب کئی کام جو ادھورے تھے وہ پورے ہوکر رہیں گے ساؤتھ انڈیا برانچ کے استحکام کے سلسلے میں آپ کی خصوصی توجہ درکار ہے۔

■ پروفیسر نذیر احمد خان لومانی، صدر شعبۂ تاریخ: انجمن آرٹس سائنس اینڈ کامرس کالج، کوآرڈینیٹر: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، اسٹڈی سینٹر انجمن کالج بھٹکل

دل کی عمیق گہرائیوں سے پھر سے ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان منتخب ہونے پر مبارکباد قبول فرمائیے ''اردو دنیا'' ہر اعتبار سے ایک منفرد رسالہ ہے۔ ہر ماہ اس کا انتظار رہتا ہے۔ ''اردو دنیا'' کے لیے نئے خریدار بنانے کی مہم میں نے شروع کی ہے۔ سردست ایک خریدار کی طرف سے سو روپئے کا ڈرافٹ ارسال خدمت ہے۔ مزید تین احباب کے پتے اور ڈرافٹ بہت جلد روانہ کیے جائیں گے۔

قارئین کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے آپ کا جریدہ بہت مقبول ہوتا جارہا ہے۔ مضامین کے ساتھ قلمکاروں کی تازہ تصاویر بھی شائع ہوں تو بہت بہتر ہوگا میری یہ تجویز ہے۔ رسالے میں مزید نکھار آسکتا ہے۔ آپ کا اداریہ رسالے کی جان ہے۔ آپ نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ اردو کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہم بنیادی سطح پر اس کے لیے مثبت کام کریں۔ صرف مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں اور سیمیناروں سے زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔

■ جوگندر ناتھ ورما، ''شری رام نکیتن'' ڈی. 195، آنند وہار، دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے آپ نے اردو زبان کے فروغ کے لیے جو خدمات کی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ یہ خیال کہ اردو زبان مسلمانوں تک محدود ہے، اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے آپ کا تعاون لازمی اور لابدی ہے اور اس لیے اردو زبان کو اپنانے والے غیر مسلم افراد کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

اردو تو کئی زبانوں کا مرکب (Combination) ہے۔ اس میں سنسکرت اور فارسی کے الفاظ ملے جلے نظر آئیں گے۔ مثلاً سنسکرت میں week کو سپتاہ کہتے ہیں اور فارسی زبان میں ''ہفتہ'' کہا جاتا ہے۔ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے لشکر۔ جیسے لشکر میں پیادہ گھوڑ سوار اور توپ خانہ سب کچھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ ویسے ہی اردو زبان میں سبھی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔

■ ڈاکٹر علی شیر خاں، چیئرمین کاروانِ اردو، مغربی بنگال، کھڑ پور، کلکتہ

مغربی بنگال میں اردو ذریعۂ تعلیم پرائمری وسکنڈری اسکول موجود ہیں جنھیں حکومت مغربی بنگال کی سرپرستی ومنظوری حاصل ہے۔ لیکن یہاں اردو داں اساتذہ کی ٹریننگ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ پی ٹی آئی کا معاملہ التوا میں ہے اور کلکتہ میں پی ٹی آئی کا سردست کوئی انسٹی ٹیوٹ بھی نہیں ہے اردو داں اساتذہ کا داخلہ بی ایڈ میں ملنا محال ہے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر کاروانِ اردو مغربی بنگال نے حکومت مغربی بنگال بالخصوص محکمۂ تعلیم سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان معلم اردو (اردو ٹیچرس ٹریننگ) کو بی ایڈ بی ٹی سی کے مساوی تسلیم کرے اور اردو داں اساتذہ کی مساوی تسلیم کرے اور اردو داں اساتذہ کی بحالی میں معلم اردو کی سند کو قبول کرے نیز معلم اردو فارغین کو بحالی میں فوقیت دی جائے۔

جامعہ اردو کی حیثیت ملک گیر اردو یونیورسٹی کی ہے اور معلم اردو جامعہ اردو کا دو سالہ تربیتی کورس ہے جس کے نصاب بی ایڈ/ بی ٹی سی کے مساوی تسلیم کیا ہے، مرکزی حکومت نے اپنے آرڈر نمبر 14021/2/78Estt.(D) مجریہ 28.6.78 میں جو وزارت داخلہ ڈپارٹمنٹ آف پرسنل اینڈ اڈمنسٹریٹو ریفارم نئی دہلی کے ذریعے جامعہ کے دیگر امتحانات کے ساتھ ساتھ معلم اردو کو ملازمت کے لیے تسلیم کیا ہے اور معلم پاس شدہ کو ہائی اسکول تک ٹیچر مقرر کیے جانے کا مجاز قرار دیا ہے۔ مرکزی حکومت نے اپنے پہلے حکم نامے کی تجدید کرتے ہوئے اپنے پہلے حکم نامے کی تجدید کرتے ہوئے اپنے دوسرے آرڈر نمبر 14021/1/2004 مجریہ 31/4/05 میں دوبارہ اس کی تصدیق کی ہے۔

معلم اردو کو این سی ای ٹی (NCET) نے اپنے دائرۂ اختیار سے باہر قرار دیتے ہوئے اپنے قوانین سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اس کے قوانین جامعہ اردو اور معلم اردو پر لاگو نہیں ہوں گے۔ مرکزی حکومت اور دیگر ریاستی حکومتیں جب معلم اردو کو بی ایڈ اور بی ٹی سی کے مساوی تسلیم کرکے اپنے یہاں بطور ٹیچر بحال

کررہی ہیں تو مغربی بنگال میں اسے کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان حالات میں حکومت مغربی بنگال سے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ٹیچروں کی بحالی میں انھیں فوقیت دی جائے۔ امید ہے کہ مسلمانوں اور اردو سے وابستہ تنظیمیں اپنے اپنے ایجنڈے میں اسے شامل کرکے حکومت وقت کے سامنے رکھیں گی اور اسے منظوری دلانے کی سعی فرمائیں گی۔

■ شکیل شاغل، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو، ترہت ڈویژن، حاجی مارکیٹ، باراچکیا، مشرقی چمپارن، بہار-845412

میں آپ کو انجمن ترقی اردو کی جانب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ڈائرکٹر کے باوقار عہدے پر دوبارہ آپ کا تقرر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے نیک فال ثابت ہوگا۔

''اردو دنیا'' پابندی سے مل رہا ہے اور اہل ذوق استفادہ کررہے ہیں۔ میرے ہاتھوں میں دسمبر ماہ کا شمارہ ہے جس میں ''ہماری بات'' کے تحت فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب کپل سبل صاحب کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ ''ہمارے ملک کے 80 کروڑ افراد اردو بولتے ہیں۔ اس کے خلاف تعصب رکھنے والے لوگ اس ملک کی سیکولر تہذیب کے دشمن ہیں۔'' میں اس کے لیے وزیر موصوف کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حق گوئی کی جو مثال انھوں نے پیش کی ہے وہ تاریخ کے اوراق میں زریں حروف میں تحریر کی جائے گی۔ میں موصوف سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں وہ زبانیں ہی قائم و دائم رہتی ہیں جو روٹی اور روزی سے منسلک ہوئی ہیں۔ اس لیے اردو کو روزی روٹی سے منسلک کرنے کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ جن ریاستوں میں اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے وہاں ہزاروں اسامیاں خالی ہیں۔ جو نئے نئے محکمے قائم کیے جاتے ہیں ان میں اردو کو تا یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بہار میں بلاک، سب ڈویژن اور ضلع تک اردو ٹرانسلیٹر اور دیگر ملازمین کے عہدے برسوں سے خالی پڑے ہیں۔ افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ اردو عملے اور ملازمین کی تنخواہ چوتھے درجے کے ملازمین سے بھی کم ہوتی ہے اور ان کو ترقی بھی نہیں ملتی۔ وہ جس عہدے پر بحال ہوتے ہیں اسی پر سبکدوش بھی ہوجاتے ہیں۔

□□□

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھگتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب ولہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔ ''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت-/60روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے اہم جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''نئی شعری روایت'' نے اردو میں جدیدیت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تین مستقل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات لکھا گیا ہے، دوسرا باب نئی جمالیات اور تخلیقی عمل ہے اور تیسرا اظہار وابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

صفحات: 240، قیمت-/127روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ہماری بات

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سرگرمیوں کی ابتدا نویں پلان کے دوران یکم اپریل سے ہوئی۔ کونسل کو حکومت ہند کی طرف سے ملک میں اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے قومی نوڈل ایجنسی کا درجہ دیا گیا اور اس کی شناخت وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کی ایک خود مختار تنظیم کی حیثیت سے قائم ہوئی۔ اسے دوسری ذمے داریوں کے علاوہ ملک کی تمام اردو تنظیموں کے درمیان باہمی تعلق قائم کرنے کی ذمے داری بھی سونپی گئی۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے فروغ میں عربی اور فارسی زبانوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے اس لیے کونسل کو ان زبانوں کے فروغ میں معاونت کی اضافی ذمے داری بھی دی گئی۔ اپنے قیام کے بعد سے اب تک قومی اردو کونسل اردو زبان وادب کو فروغ دینے کے لیے متواتر کوشاں رہی ہے۔

قومی اردو کونسل ان مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے جن کی تکمیل کے لیے اس کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ہر سال اپنا لائحۂ عمل مرتب کرتی ہے اور اس کے نفاذ کو یقینی بناتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ہونے والی ترقیات اور عصری تناظر سے ہم آہنگ علوم کا رشتہ اردو سے قائم کرنے کے لیے کونسل نے بعض تکنیکی کورس شروع کیے جیسے کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی اور کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن، اس مقصد کے حصول کے لیے ملک گیر سطح پر تربیتی مراکز قائم کیے گئے۔ سال 09-2008 کے دوران جولائی تا اکتوبر سیشن میں 16980 طلبہ نے اس کورس میں داخلہ لیا جن میں 5586 لڑکیاں ہیں۔ اب تک 73785 طلبہ بہ شمول 25424 طالبات کو ڈپلوما سرٹیفکیٹ دیا جاچکا ہے۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق ان میں سے بیشتر طلبہ اور طالبات کو نجی اور پبلک سیکٹر میں نوکریاں حاصل ہوگئی ہیں، باقی Self Employed ہیں اور خود اپنے ادارے چلا رہے ہیں۔ یہ کونسل کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ خطاطی اور گرافک ڈیزائن کے کورس بھی کامیابی سے چل رہے ہیں یہ بھی روزگار مرکوز ہیں اور ان سے خوش نویسی کے روایتی فن کو جدید گرافک ڈیزائن سے مربوط کرنے میں بھی مدد مل رہی ہے۔

کونسل مختلف غیر سرکاری تنظیموں کو اردو کے فروغ میں معاون سرگرمیوں کے لیے مالی تعاون فراہم کرتی ہے۔ 09-2008 میں 53 رضا کار تنظیموں کو مالی مدد دی گئی۔ بعض کتابیں جو علمی ادبی قدر و قیمت کی حامل تو ہوتی ہیں لیکن ان میں عوامی دلچسپی کا مواد کم ہوتا ہے اس لیے کاروباری نقطۂ نظر سے کتابیں چھاپنے والے ناشرین انھیں چھاپنے سے گریز کرتے ہیں۔ اپنی ایسی کتابیں خود چھاپنے والے مصنفین کو کونسل مالی مدد فراہم کرتی ہے اور جن کتابوں کی اشاعت میں کونسل کی مالی اعانت شامل نہ ہو انھیں یک مشت خرید کر اردو لائبریریوں کو ہدیۃً بھجوا دیتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت رسائل بھی خریدے جاتے ہیں۔ مذکورہ مالی سال میں کونسل نے 38 مسودات کی اشاعت کے لیے مالی تعاون دیا اور 191 کتابیں بہ شمول 54 جرائد خرید کر 480 لائبریریوں کو ہدیۃً بھجوائیں۔

اردو کونسل ہندوستان میں اردو کتابوں کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ بھی ہے۔ شعروادب کے علاوہ اس نے جغرافیائی تاریخی، تہذیبی، تمدنی، لسانی، اقتصادی، معاشرتی، طبی، سائنسی، سیاسی، انتظامی اور عدالتی نظام سے تعلق رکھنے والے جن موضوعات پر کتابیں شائع کی ہیں ان کی تعداد اب تک بارہ سو سے تجاوز کر چکی ہے۔ لغات، نصابی اور امدادی نصابی کتب ان کے علاوہ ہیں۔ ان کتابوں کی رفتار فروخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تصور سراسر غلط ہے کہ اردو اب صرف شعروادب کی زبان ہوکر رہ گئی ہے۔

اردو والوں کے ذوق مطالعہ کو بڑھاوا دینے کے لیے قومی اردو کونسل نے کتابی میلوں کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ کونسل اب تک دہلی، ممبئی، لکھنؤ، حیدرآباد، کولکاتا، پٹنہ اور سری نگر میں دس کتابی میلے منعقد کرچکی ہے جن میں سرکاری اور نجی ناشرین بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور ہر میلے میں لاکھوں روپے کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں جس سے اردو کتابوں کے شائقین کی قوت خرید کا بھی اندازہ ہوا۔ کونسل نے خود اپنی مطبوعات کو دوردراز کے اردو حلقوں تک پہنچانے کے لیے موبائل وین کا سہارا بھی لیا جو اب تک ملک کے مختلف شہروں کے تین کامیاب دورے کرچکی ہے۔

قومی اردو کونسل نے ہندی اور انگریزی میڈیم سے اردو سکھانے کا مراسلاتی کورس بھی شروع کیا۔ یہ کورس بھی کامیابی سے چل رہا ہے اور ہر سال ہزاروں طلبہ اور طالبات جن میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب شامل ہیں، اردو سیکھ رہے ہیں اور اردو کے ایک اہم قومی زبان ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔

کونسل کے فنکشنل عربی سکھانے کے کورس کی اہمیت دوگونہ ہے، اولاً اس لیے کہ عربی کا اردو سے قریبی تعلق ہے اور دوسرے اس لیے کہ فنکشنل عربی سیکھ لینے کے بعد عرب ممالک میں روزگار کے جو مواقع موجود ہیں ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اب تک قومی اردو کونسل کے دفاتر راما کرشنا پورم نئی دہلی میں دو سرکاری عمارتوں میں تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قریب جسولہ میں قومی اردو کونسل کی اپنی عمارت بن کر تیار ہوگئی ہے جہاں جلد ہی یہ دفاتر منتقل ہوجائیں گے۔ وہاں کا پوسٹل ایڈریس ہے: **"فروغ اردو بھون"، پلاٹ نمبر-9، ایف، سی، 33، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی -110025**

اردو ملک کی ایک اہم زبان ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے اسے فروغ دینے کی کوششیں بھی کی جاتی رہی ہیں، یہ اس کا حق ہے لیکن خود اردو والوں کو بھی اپنی زبان کی بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہنا چاہیے۔ یہ ان کی انفرادی ذمے داری بھی ہے اور اجتماعی ذمے داری بھی اور اس سے روگردانی اپنے ایک اہم فریضے سے روگردانی کے مترادف ہوگی۔

تو آیئے نئے سال کے آغاز میں ہم صمیم قلب سے یہ عہد کریں کہ ہماری زبان کے ہم پر جو حقوق ہیں ان کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج و ترقی کے جو تقاضے اور مطالبے ہیں انھیں ہم پورا کریں گے۔

□□□

شکیل الرحمٰن

اردو فکشن میں ٹریجیڈی کا جمال—سعادت حسن منٹو کے حوالے سے

حضرت فریدالدین عطار کی تخلیق ''منطق الطیر'' میں ''پتھر کے انسان'' کی ایک معنی خیز تمثیل ہے۔ چین کے ایک پہاڑ پر پتھر کا ایک انسان ہے جس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتا رہتا ہے۔ آبشار کی مانند پہاڑ سے نیچے اترتا رہتا ہے، دن ہو یا رات یہ آنسو تھمتا ہی نہیں ہے، پتھر کے اس انسان کے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی بھاپ بن کر اُوپر چلا جائے اور بادلوں میں جذب ہو جائے تو قیامت تک زمین پر غم اور اُداسی کی بارش ہوتی رہے گی۔ عطار اس تمثیل میں بتاتے ہیں کہ سچائی یہ ہے کہ پتھر کا یہ انسان علم و دانش اور الوہی علم کا پیکر ہے، کہتے ہیں اگر تم چین جاسکتے ہو تو ضرور جاؤ اور اسے ڈھونڈ نکالو، دیکھ لو اسے، یہ دھرتی یہ زمین اندھیرے میں ہے تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے، تمھاری روح کی تابناکی اور تمھارے علم کی روشنی سے اس گہرے اندھیرے میں جو بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے سچائی ہیرے کی مانند چمکتی نظر آتی ہے اور اس چمک سے راحت نصیب ہوتی ہے، اس سچائی، اس ہیرے کو اٹھا لو زندگی کا یہی حسن تمھیں انبساط عطا کرے گا۔ یہ ہیرا دراصل غم اور اداسی اور تاریکی کے اندر راحت بخشتا رہتا ہے۔ ادبیات میں ٹریجیڈی اور ان کی جمالیات کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، بڑا تخلیقی فنکار ٹریجیڈی میں حسن کو پالیتا ہے المیات کے اندھیرے میں وہ چمکتے ہوئے ہیرا کو پالیتا ہے اور اس کی یہی بہت بڑی دین ہوتی ہے۔

اردو فکشن میں جن تخلیقی فنکاروں نے ٹریجینڈی پیش کرتے ہوئے اس کی جمالیات کی پُر اسرار کیفیتوں سے جمالیاتی انبساط عطا کیا ہے اُن میں پریم چند، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے نام بہت اہم ہیں۔

آج کی محبت میں ہم سعادت حسن منٹو کے چند المیہ انسانوں کی جمالیات پر گفتگو کر رہے ہیں

پریم چند کا ذکر آیا اور ''کفن'' کے گھیسو اور مادھو کے کردار ابھر کر سامنے آجاتے ہیں احمد ندیم قاسمی کی کہانیوں کی جانب ذہن کے جاتے ہی ''بین'' کی رانو اور لتاں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اسی طرح سعادت حسن منٹو کے بارے میں سوچتے ہی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سامنے کھڑا ہو جاتا ہے یہ بڑبڑاتے ہوئے ''اوپڑ دی گڑ دی اینکس دی بے دھیان ونگ دی دال آف دی لالٹین!''

ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹریجیڈی اور اس کے جمال کی ایک ناقابل فراموش کہانی ہے یہ کہانی برصغیر کی تاریخ کے ایک انتہائی المناک باب کو جذب کیے ہوئے ہے، تخلیقی فنکار نے پورے المیے کو ایک کردار میں اس طرح جذب کر دیا ہے کہ اس کردار کی حیثیت ایک معنی خیز تہہ دار سمبل کی ہوگئی ہے۔

میں نے اپنی کتاب ''منٹو شناسی'' میں کہا تھا کہ تقسیم ہند کی ٹریجیڈی پر اردو ادب میں یوں تو بہت سے افسانے لکھے گئے ہیں لیکن اس بڑے المیے کا سب سے اہم عنوان سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ہے، یہ کردار انوکھا اور حیرت انگیز ہے، روح یا باطن میں کپکپاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ ایک عہد کے کرب کا زبردست اعلانیہ ہے، میں نے کہا ہے کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' درد کے رشتے کی ایک لازوال کہانی ہے، برصغیر کا ایسا آشوب نامہ یا شہر آشوب ہے کہ جس میں فنکار نے ایک کردار کے ذریعے ایک بڑی وحدت کے ٹوٹنے کا ماتم کیا ہے ایسا ماتم کہ محسوس ہوتا ہے جیسے زمانے کا کلیجہ اچانک پھٹک گیا ہو اور اس کا پورا وجود اندر میں لہولہان ہو، تمثیل کے حسن کو لیے ہوئے یہ افسانہ ڈراما بن جاتا ہے بڑا تخلیقی فن ڈراما ہی تو ہوتا ہے!

یہ پاگل بشن سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنے والا ہے، ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے یہی سوال کرتا رہتا ہے، کوئی بھی پاگل اسے یہ بتا نہیں پاتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ واقعی ہے کہاں، بشن سنگھ کا نام ہی ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑ گیا ہے، وہ جانے کب سے ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا ہے، پاگلوں کے تبادلے میں اسے بھی ہندو سکھ پاگلوں سے بھری لاریوں میں ہندوستان جانا ہے لیکن وہ جانا نہیں چاہتا ہے یہی پوچھتا رہتا ہے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔''

ایک صبح سورج نکلنے سے پہلے بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلتی ہے سب دیکھتے ہیں وہ شخص جو مسلسل کھڑا رہا اوندھے منھ گرا ہوا ہے! یہ فلک شگاف چیخ تاریخ کے کلیجے کے پھٹنے کی بھی آواز ہے ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان ہے ادھر ایسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان، درمیان میں زمین کے اُس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا ہے! تقسیم کے بعد جو ایک آتش فشاں پھٹا تھا اس سے لاوے کا ایک سمندر پھیل گیا تھا زمین سے رشتے کا احساس مٹانے کی کوشش ہو رہی تھی، افسانوی ادب میں پہلی بار المیہ کا ایک مضطرب، بے چین، حد درجہ معنی خیز اور آزاد ''وژن'' جنم لیتا ہے جو اچانک واقعہ، اس کی جہات، تضادات اور داخلی نفسی اور اعصابی تصادم اور پیچیدگیوں کو سامنے رکھ دیتا ہے۔ ایک چیلنج کی صورت جیسے سرگوشی کرتا ہو ''اس کا جواب دو!!'' اور ہم اس چیلنج کے سامنے خود کو بے بس اور بہت حد تک مجبور پاتے ہیں۔

یہ کردار سعادت حسن منٹو کے جمالیاتی وژن کا ایک کرشمہ ہے، بشن سنگھ کی ''نفسیاتی جسمانی'' (Psycho-Physical) کیفیت قاری کے احساس میں جذب ہوجاتی ہے، کردار دور کا نظارہ نہیں رہتا اپنے وجود میں جذب ہوجاتا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ فنکار کا جمالیاتی تجربہ ہے جو قاری کا تجربہ بن جاتا ہے، تمام ''سنسیشن (Sensations) کے ساتھ جو بشن سنگھ کے سنسیشن ہیں، فنکار کے تخلیقی تخیل اور اس کی داخلی توانائی کا اس وقت زبردست احساس ہوتا ہے جب ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ایک جمالیاتی امیج (aesthetic Image) بن جاتا ہے، مرکزی کردار کے زوال (Fall) سے جو جمالیاتی آسودگی اور راحت ملتی ہے اس کو ارسطو نے کتھارسس (Catharsis) کہا تھا، نفسیاتی جسمانی کیفیتوں کے ساتھ جذبات کا المناک سفر اختتام پر جمالیاتی آسودگی بخش دیتا ہے، سعادت حسن منٹو نے کہانی سناتے ہوئے واقعات میں جو ''ہارمونی'' (Harmony) پیدا کی ہے اور جس فنکارانہ تنظیم کی صلاحیت کا اظہار کیا ہے تاریخ اور تہذیب کے ناقابل فراموش تجربوں کے رشتوں کے احساس کے مطابق ہے۔ ادب میں ٹریجیڈی کا حسن اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب المیہ اپنے مضمر جوہر (Essence) کو ظاہر کرتے ہوئے ایک ''وژن'' (Vision) بن جاتا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے کردار کا زوال (Fall) ایک بڑے معاشرے اور تاریخ کے ایک بڑے المناک دور کا زوال ہے۔ اس کردار کے زوال کے ساتھ ہی معاشرے کا جیسے آئینہ اچانک ٹوٹ جاتا ہے اور ٹوٹے ہوئے ہر شیشے میں ایک عجیب وغریب چہرہ نظر آتا ہے۔ المیہ ادب میں مرکزی کردار کے زوال کے ساتھ ہی ایک عجب نفسیاتی سکون ملتا ہے ایک راحت ملتی ہے پورے وجود میں ایک کتھارسس ہوتی ہے، ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹریجیڈی کا وہ عرفان ہے جو ایک بڑا تخلیقی فنکار ہی حاصل کر کے دوسروں کو عطا کرسکتا ہے اور سعادت حسن منٹو نے یہ کام کیا ہے۔

''سرمہ'' کی فہمیدہ بھی ایک المیہ کردار ہے، اس کے ذہن کی نفسیاتی گرہ توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے فہمیدہ اور سرمہ دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں جذب ہوتے جاتے ہیں نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ فنکار نے اس اکائی کو مرکز نگاہ بنا دیا ہے۔ فہمیدہ سرمہ پسند کرتی ہے اپنے گورے چہرے کو دیکھتے ہوئے یہ چاہتی ہے کہ اگر آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سی سیاہی شامل ہوجائے تو کیا اچھا ہو، شادی ہوتی ہے تو اپنی ماں سے چاندی کی سرمہ دانی بھی لیتی ہے۔ شادی کے بعد اس کا شوہر جب حیرت سے یہ دریافت کرتا ہے کہ وہ اتنا سرمہ کیوں لگاتی ہے تو وہ جھینپ جاتی ہے جواب ہی نہیں دیتی۔ شوہر کے ٹوکنے کے بعد سرمہ لگانا چھوڑ دیتی ہے لیکن جب ایک برس بعد ایک بیٹے کی ماں بن جاتی ہے تو سرمہ نکالتی ہے اور اپنے نومولود بیٹے کی آنکھوں میں لگاتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اسے بڑا نفسیاتی سکون ملتا ہے جمالیاتی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ بچے کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس پر دیوانگی سی طاری ہوجاتی ہے، ایک دیوانی عورت کہ جس کے تحت الشعور میں سرمہ اور سرمہ دانی موجود ہے۔

''اس کے ہوش وحواس گم ہوگئے تھے، وہ کوئلے اٹھاتی، انھیں پیستی اور پھر اپنے چہرے پر کالک ملنا شروع کردیتی۔''

شوہر سے باتیں کرتی ہے تو سرمے کے کالک کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضرور کرتی ہے ایک شب وہ سرمہ لگا کر سو جاتی ہے تو صبح اٹھتی ہی نہیں اس کا انتقال ہوجاتا ہے اس کا خاوند دیکھتا ہے مردہ بیوی کے ساتھ ایک گڑیا ہے کہ جس کی آنکھیں سرمہ دانی بنی ہوئی ہیں۔

تخلیقی فنکار کی گہری نظر فہمیدہ کے تحت الشعور پر ہے، فہمیدہ کی ''سائیکی'' موضوع ہے، اس المیہ کردار کا زوال نفسیاتی سکون وراحت بخشتا ہے، یہ انسان کی نفسیات ہے کہ وہ کسی المیہ کردار کو زیادہ دیر کشمکش میں دیکھنا نہیں چاہتا، المیہ کردار سے قاری کی جذباتی وابستگی غیر معمولی نوعیت کی ہوتی ہے، اس کہانی میں ابتدا سے مرکزی کردار سے جذباتی رشتہ پیدا ہوجاتا ہے، ہمدردی بھی ہوتی ہے اور محبت بھی، اس کی مسلسل کشمکش اچھی نہیں لگتی۔ جی چاہتا ہے مرکزی المیہ کردار جلد از جلد کشمکش سے نجات حاصل کرلے تاکہ نفسیاتی سکون ملے جب فہمیدہ کا انتقال ہوجاتا ہے تو قاری کو نفسیاتی سطح پر ایک راحت ملتی ہے کہانی کے المیہ کا جمال اس گڑیا کی آنکھوں میں سمٹ آتا ہے، جس میں سرمہ بھرا ہوا ہے، آنکھیں سرمے سے لبریز ہیں۔

یہ کہانی بھی سعادت حسن منٹو کے المیہ افسانوں کی جمالیات کو پیش کرتی ہے مگر ایک دوسرے انداز سے!!

''ہتک'' کی سوگندھی کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے درد کا ایک رشتہ قائم ہوتا ہے اور یہی اس تخلیق کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ سوگندھی طوائف ہے گاہک آتے ہیں اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجوڑ کر چلے جاتے ہیں پانچ برس ہوگئے ہیں اس نے زندگی اور اس کے جلوؤں کو دیکھا کب ہے اس کا عام نرخ دس روپے ہے۔ ان میں ڈھائی روپے رام لال دلال کے ہوتے ہیں، ساڑھے سات روپے روز مل جاتے ہیں۔ اس کا نام نہاد عاشق مادھو بھی اکثر آجاتا ہے اور اس سے دس پندرہ روپے وصول کرلیتا ہے۔ اس کے کمرے میں ایک تصویر مادھو کی بھی ہے غالباً اس لیے ہے کہ وہ اسے پسند کرتی ہے اس سے زیادہ اس کی دلچسپ گفتگو پسند آتی ہے۔ جانتی ہے باہر کی زندگی کے بارے میں وہ جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے پھر بھی اس کی باتوں کو پسند کرتی ہے۔ ایک شب دو بجتے دلال سوگندھی کو نیچے لے آتا ہے کہتا ہے موٹر میں ایک گاہک آیا ہے جو اسے

ساتھ لے جانا چاہتا ہے، جب نیچے آتی ہے اور گاہک اسے دیکھتا ہے تو یہ کہہ کر ''ہونھ''۔ اپنی گاڑی پر چلا جاتا ہے۔ یہ لفظ ''ہونھ'' سوگندھی کے کانوں میں جھنجھنانے لگتا ہے۔ اس نے اسے پسند نہیں کیا! ایک ''ہونھ'' نے اس کے پورے وجود کو جھنجھنا کر رکھ دیا ہے، غصے میں کمرے کی ہر تصویر توڑ دیتی ہے مادھو کی تصویر بھی۔ یہ نفسیاتی ردِعمل کہانی میں ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ توڑ پھوڑ کے بعد ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے

''ہر شے خالی ہے جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہوگئی ہے!

اپنے خارش زدہ کتے کو لے کر سو جاتی ہے۔

کہانی میں المیے کے ارتعاشات (Vibrations) ہر لمحہ متاثر کرتے ہیں اور یہ اس کہانی کا سب سے بڑا حسن ہے۔ مرکزی کردار سے درد کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ حسن یہ بھی ہے کہ مرکزی کردار خود المیہ کا جواب بن گیا ہے۔ اس المیہ کردار کا جمال اس کی فطرت میں ہے کہ جس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جہنم کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی اس کے دل میں محبت اور انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کا چراغ روشن ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی ماسک نہیں ہے، اس کی اپنی طاقت یا انرجی اسے زندہ رکھتی ہے۔ سوگندھی کا کمرہ جتنا غلیظ اور ناپاک ہے اس کا دل اتنا ہی صاف ستھرا روشن ہے۔ کمرے کی بے ترتیب زندگی اس کے باطن کی اس زندگی سے مختلف ہے جہاں محبت اور ہمدردی کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ریاکار اور فریبی نہیں ہے۔ جان بوجھ کر فریب کھاتی ہے وہ المیہ کردار ہے لیکن اپنے ضمیر میں زندگی کی بعض خوبصورت قدریں چھپائے بیٹھی ہے انہیں عزیز جانتی ہے۔ المیہ کا جمال یہی ہے۔ وہ محبت کرسکتی ہے لیکن اسے اب تک محبت کا جواب محبت سے نہیں ملا ہے۔ مادھو اس کا ایک انتہائی تلخ تجربہ ہے۔ یہ نیک ضمیر کی عورت پیار پانے کی آرزو لیے بیٹھی ہے، وجود میں ایک عجیب تشنگی ہے۔ اس کی ذات کی یہ روشن جہت کہانی میں حسین اور دلفریب ارتعاشات پیدا کردیتی ہے۔ مرکزی کردار کا معنوی حسن نظر آنے لگتا ہے۔ اس کا ذہنی کرب بھی متاثر کرتا ہے اور ایک بار کھلکھلا کر ہنستا بھی ہے۔ آخر میں اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں لے کر سو جاتی ہے۔ اس کا سبز طوطا پنجرے میں ایک خاموش تماشائی بنا ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا ہے!

بلاشبہ یہ کہانی اردو فکشن کی ممتاز کہانیوں میں ہے کہ جس میں المیہ اور اس کی جمالیات دونوں کا تاثر گہرا ہوتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کی المیہ کہانیوں اور ان کی جمالیات کے مطالعے میں جو افسانے توجہ طلب بنتے ہیں ان میں ''ممد بھائی''، ''سرمہ''، ''شاہ دولے کا چوہا''، ''شاردا''، ''خوشیا''، ''موذیل''، ''ممی''، ''بابو گوپال ناتھ'' بہت اہم ہیں۔ کرداروں اور واقعات کے باطنی حسن کے معبد (Temple of Inner Bean) میں داخل ہونا آسان نہیں ہے، فنکار نے یہ کام کیا ہے! □□□

پتہ:
Madhuban, A-267, South City,
Gurgaon-122001
Haryana

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے

اردو زبان کی تدریس

مصنف: معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ کتاب طلبہ و اساتذہ کی انھی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 148، قیمت: -/29 روپے

سکندر احمد

وہابی تحریک اور اردو

مشتاق احمد یوسفی نے "خاکم بدہن" میں لکھا ہے "اواخر ماہ کی چاندنی میں فراز بالاکوٹ پر اس مقبرے کے خطوط دکھنے لگے، جہاں سوا سو سال پہلے، اسی رُت اور اترتے چاند کی انھی تاریخوں میں ایک جیالے نے اپنے خون سے اپنی قوم کے داغوں کو دھویا تھا اور جہاں آج بھی خدا کے سادہ دل بندے نسوار کی نذر چڑھا کر مرادیں مانگتے نظر آجاتے ہیں۔"

حاشیے میں جیالے کا نام لکھا ہے "حضرت شاہ اسمٰعیلؒ"۔ تحریر آراستہ اور مسجع ہے لیکن انداز بیان وہابی تحریر سے موافقت اور مواد وہابی تحریک سے مطابقت نہیں رکھتا۔ تاہم ایک بات بغیر کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ دور کے ایک بلند پایہ ادیب کے دل میں حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی جو قدرومنزلت ہے، غیر مشروط اور غیر متزلزل ہے۔ اردو پر وہابی تحریک کے اثرات پر گفتگو کچھ تاخیر سے شروع ہوئی۔ اس امر پر سب سے پہلے قیام الدین احمد نے The Wahabi Movemnet in India میں نظر ڈالی اور اس ضمن میں مختصراً جو کچھ کہا وہ یوں ہے:

"وہابی تحریک کا ایک اہم اور نظروں سے پوشیدہ ضمنی فیضان وہ زور دار جنبش ہے جو اس نے اردو زبان خصوصاً نثر نگاری کی رفتار ترقی کو دی۔ اپنے پیغاموں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش میں اور تبلیغی تحریکوں کی طرح اس نے مقامی زبانوں کے استعمال پر بہت زور لگایا۔ اگرچہ اعلیٰ طبقے کی عام زبان فارسی تھی، وہابی قائدین نے اردو کا زیادہ استعمال کیا اور اس زبان میں زیادہ رسالے لکھے۔"

(طبع دوم 1976، ص 360 ہندوستان میں وہابی تحریک، مترجم محمد مسلم عظیم آبادی، نفیس اکادمی کراچی)

مقتبس حوالے سے دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

(1) نثر نگاری کی رفتار کی ترقی

(2) اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال

بات سامنے کی ہے، کوئی خاص نکتہ ادبا کے حوالے سے واضح نہیں ہوتا۔ وہابی تحریک کا زمانہ ہی ایسا تھا جس میں زبان فارسی سے اردو کی طرف مائل ہو رہی تھی اور ادب شعر سے نثر کی طرف۔

مذکورہ کتاب یعنی The Wahabi Movement in India کے مصنف جناب قیام الدین احمد ہیں اور مترجم محمد مسلم عظیم آبادی اور دونوں کا تعلق ایک ہی خانوادے سے تھا یعنی صادق پوری خاندان جو وہابی تحریک میں پیش پیش تھا لہٰذا کسی کو ان کی معروفیت پر شبہ ہوسکتا ہے۔

دو کتابیں اور موجود ہیں جن کا ذکر نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ ایک کتاب انگریزی میں ہے "Wahabi Movement" اور دوسری کتاب یا کتابچہ آپ جو کہہ لیں۔ اس کا نام ہے "صادق پور پٹنہ — قربان گاہ آزادیٔ وطن" انگریزی کتاب کے مصنف ہیں فصیح الدین بلخی اور اردو کتابچے کے مصنف ہیں قیوم خضر۔ مذکورہ دونوں حضرات بریلوی مسلک کے تھے لیکن انھوں نے کہیں بھی مسلکی اختلافات کو قلم کی معروضیت پر حاوی نہ ہونے دیا۔

وہابی ادب کو اردو کے حوالے سے سب سے پہلے موضوع گفتگو بنایا خواجہ احمد فاروقی نے حالانکہ یہ مضمون اصلاً اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں لکھا گیا تھا اور موضوع بھی ادب کے حوالے سے نہیں تھا بلکہ تحریک کے حوالے سے تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"میرے مقالے کا موضوع انیسویں صدی کے مجاہدین کی تحریک ہے جس کو عرف عام میں وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔"

(ص۔6، اردو میں وہابی ادب، 1969)

بات ظاہر ہے مضمون کا اصل حوالہ ادب نہیں بلکہ تحریک ہے۔ انگریزی میں انھوں نے مقالے کو کیا عنوان دیا تھا یہ اس کتابچے میں موجود نہیں، تاہم کتابچے کا عنوان ہے۔ "اردو میں وہابی ادب"

کتابچے کا اصل متن 37 صفحات پر مشتمل ہے، حروف جلی ہیں ورنہ مضمون کتابچے کی شکل اختیار نہ کر پاتا۔ اس مضمون میں وہابی ادب کے محاسن پر گفتگو اخیر کے چار صفحات میں کی گئی ہے۔ وہابی تحریک کے ذکر کے فوراً بعد رائج الوقت نثر کے متعلق خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں۔

"نادر شاہ کا ایلچی جب دہلی آیا ہے، تو محمد شاہ کے منشیوں نے تین برس اس سوچ میں صرف کردیے کہ شاہ ایران کو کیا القاب لکھا جائے۔ اس وقت تمام اوصاف اسم تفضیل کے صیغے میں لکھے جاتے تھے۔ القاب و آداب مقرر تھے اور مرجز مقفیٰ اور مسجع نثر عام طور پر پسند کی جاتی تھی۔ رجب علی بیگ سرور صاحب فسانۂ عجائب کو مقفیٰ نگاری کا اتنا شوق تھا کہ ایک خط سخت پریشانی اور اذیت کے عالم میں اپنے بیٹے کو لکھا ہے، اس میں معذرت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں: یہ دو سطریں انتشار طبیعت میں لکھی ہیں، کوئی چست فقرہ نہ نکلا، اس آرٹ کا وہی

حشر ہوا جو ہونا چاہیے تھے۔ جب نئی ضرورتوں کی صبح نمودار ہوئی تو رات کا غازہ ڈھل گیا اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ بھی بہہ نکلا۔ تکلفات کے اس طلسم کے توڑنے میں وہابی تحریک کا زبردست ہاتھ ہے۔ یہاں یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ راست اور سلیس نثر کا رواج محض فورٹ ولیم کالج یا دہلی کالج کی بدولت نہیں ہوا۔ اس نیکی کے پھیلانے میں وہابی تحریک کو بھی دخل ہے جس نے ملک کی ایک بڑی دیہی آبادی کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا تھا۔''

(ص-39 ''اردو میں وہابی ادب'')

مشتاق احمد یوسفی ہی کی طرح خواجہ احمد فاروقی کا جملہ ''......رات کا غازہ ڈھل گیا اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ بھی بہہ نکلا۔'' کسی طور پر بھی وہابیوں کی سادہ سلیس نثر کی نمائندگی کرتا ہوا نظر نہیں آ رہا ہے۔

خواجہ احمد فاروقی مزید فرماتے ہیں کہ اس تحریک نے آزادی، بیباکی اور جرأت سے مملو انداز بیاں کو روشناس کیا۔ خواجہ احمد فاروقی نے گفتگو کو تحریری نثر تک ہی محدود رکھا ہے، یہ انداز بیاں صرف تحریروں تک محدود نہ تھا۔ وعظ و تبلیغ کے لیے اس انداز بیاں کو وہابیوں نے تقاریر میں بھی استعمال کیا اور ان جگہوں پر بھی کیا جہاں سابقہ صرف ایک شخص سے ہو۔

1850 کے دسمبر کے اواخیر میں ولایت علی، یحییٰ علی، فیاض علی، دیگر افراد خانہ اور تقریباً 250 معتقدین کے ہمراہ، ستھانہ کے لیے کوچ کیا۔ ان لوگوں نے سفر کے دوران تقریباً دو مہینے دلّی میں قیام کیا۔ عارضی مستقر دلّی کی فتح پوری مسجد کے نزدیک تھا۔ وہ بعد نماز جمعہ اکثر تقریر کیا کرتے۔ ان کی تقاریر کی دھوم مچی اور انھیں بہادر شاہ ظفر نے لال قلعہ بلوا بھیجا۔ بادشاہ کے سامنے ولایت علی نے عذاب قبر، ہنگامۂ حشر اور دوزخ کی تکالیف کا ذکر شروع کر دیا۔ وزیراعظم نے سرگوشی میں ولایت علی کو متنبہ کرنے کی کوشش کی کہ بادشاہ کے سامنے خوشگوار باتیں کرنی چاہئیں مثلاً جنت کی مسرتوں کی۔ ولایت علی نے موضوع کو تبدیل کرنے سے انکار کر دیا اور تقریر کو اپنے نہج پر قائم رکھا۔ دربار میں برٹش ریذیڈنٹ بھی موجود تھا۔ تقریر کا اثر یہ ہوا کہ بہادر شاہ ظفر، ان کے شہزادے، بیگم زینت محل اور دیگر حاضرین مجلس زار زار رونے لگے۔

اس وقت جو حالات تھے، ان میں بادشاہ کے سامنے وہ بھی اس وقت جب برٹش ریذیڈنٹ موجود ہو، تنبیہہ کے باوجود ایسی تقریر کرنا جرأت اور حق گوئی کا بیباکانہ مظہر ہے۔

انھی ولایت علی کا ذکر ہے:

''......ایک بنکر کے مکان پر پہنچے جو اپنے کپڑا بننے کے کام میں مشغول تھا۔ اس سے فرمانے لگے کہ دنیا میں رہنے کے لیے کھانے پینے کا انتظام اور اپنے اہل وعیال کی پرورش کے لیے آپ سب کچھ کر رہے ہیں، لیکن آخرت کے لیے جہاں آپ کو ہمیشہ رہنا ہے، آپ کیا کام کر رہے ہیں۔ غرض دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی پائیداری کی طرف توجہ دلانے لگے۔ آپ کا لباس بہت ہی معمولی تھا۔ بنکر نے آپ کو بھیک مانگنے والا سمجھا اور چار پیسے دے کر ہٹانا چاہا۔ آپ نے فرمایا بھائی پیسے اپنے پاس رکھو اور جو میں کہتا ہوں اسے کان لگا کر سنو۔ اس پر بھی حقیقت اس بنکر پر ظاہر نہ ہوئی۔ اب اس نے دو چار آنے دے کر ہٹانا چاہا۔ اس پر بھی پھر آپ نے وہی فرمایا کہ بھائی پیسے اپنے پاس رکھو اور جو کچھ میں کہتا ہوں اسے غور سے سنو۔ اب وہ شخص ناراض ہوگیا اور ماڑی کی کوچی اٹھا کر کہا، اچھا اب ہم آپ کو سمجھائیں گے۔ مولانا نے فرمایا مارنا ہو تو مار لو لیکن جو میں کہتا ہوں اسے سنو۔ اب اس شخص کے کان کھڑے ہوئے۔ مولانا موصوف نے پھر فرمایا کہ تم جو کام کر رہے ہو کرتے جاؤ صرف میری باتوں کی طرف کان لگاؤ۔ اب وہ شخص ان کی باتوں کو سننے لگا۔

(ضمیمہ، تذکرۂ صادقہ)

مقتبس حوالے میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو انتہائی مشکل حالات میں اپنی بات کو کہنے کا حوصلہ۔ دوسری بات یہ کہ ''تذکرۂ صادقہ'' کا ترجمہ ہے اور مترجم بھی صادق پوری خاندان سے ہیں۔ ترجمہ تصنع اور غیر ضروری آرائش سے پاک ہے۔ اتفاق سے انگریزی نثر بھی غیر ضروری شعریت سے مذہبی مباحث کی وجہ سے ہی آزاد ہوئی۔ ملکہ الیزبتھ کے دور حکومت میں سترھویں صدی میں انگلستان میں مذہبی بحثیں چھڑ گئیں۔ مختلف ممالک کے ردّ و قبول میں سینکڑوں رسالے لکھے گئے۔ مقصد تھا اپنے عقائد کو صحیح اور مخالفین کے عقائد کو غلط ثابت کرنا۔ جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تحریروں کا اثر دیرپا نہیں ہوتا، اس بات کو فریقین خوب سمجھتے تھے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ موقف کی پیش کش مدلل، منطقی استدلالی اور غیر جذباتی ہو، تاکہ پڑھنے والا لفاظی میں نہ الجھ کر فوراً قبول کر لے۔

اس مماثلت کو خواجہ احمد فاروقی نے دریافت نہیں کیا بلکہ کلیم الدین احمد نے اس پر روشنی ڈالی۔ فرماتے ہیں:

''اگر وسیع پیمانے پر انگریزی نثر میں یہ رسالے نہ لکھے جاتے تو پھر سوئفٹ، اڈیسن اور اسٹیل وغیرہ کا کام آسان نہ ہوتا۔ اسی طرح یہ کہا جاسکتا ہے، اگر یہ رسالے یہ کتابیں نہ ہوتیں تو سرسید اور حالی کا کام اتنا آسان نہ ہوتا۔'' (اپنی تلاش میں، ص 192 حصہ اوّل)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دہلی کالج کی نثر بھی وہابی تحریروں کے زیر اثر معرض وجود میں آئی نیز یہ کہ سادہ اور آسان نثر انگریزوں کی نہیں بلکہ وہابی تحریک کی دین ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کے کتابچے میں ''تقویت الایمان'' کے حوالے سے

چند سطریں کچھ یوں ہیں:

''تقویت الایمان'' کا پہلا حصہ ایسی سلیس، صاف اور مربوط اردو میں لکھا گیا ہے کہ اردو کی چند کتابیں ہی اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔''

(ص-41، اردو میں وہابی ادب)

میں نے کوشش کی کہ وہابیت سے متعلق چند کتب و رسائل کا آزادانہ مطالعہ کیا جائے۔ ''ہندوستان میں وہابی تحریک'' میں کتابوں کے حوالے ڈھونڈے۔ جن کتابوں کے نام سامنے آئے اور جو شہر میں دستیاب ہوسکتی تھیں، وہ ہیں:

(1) تاریخ عجیب معروف بہ کالا پانی (مصنف جعفر تھانیسری)

(2) تواریخ عجیب (مصنف جعفر تھانیسری)

(3) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک (مصنف مسعود عالم ندوی)

(4) تذکرۂ صادقہ

(5) رسالۂ تعزیہ

(6) مثنوی شہر آشوب

(7) درمقال

کلیم الدین احمد نے بھی تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے

(1) رسائل تسعہ

(2) تقویت الایمان

(3) صراط مستقیم

محمد مسلم عظیم آبادی نے تاریخ عجیب کو معروف بہ کالا پانی لکھا ہے۔ کالا پانی کے دیباچے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ عجیب کا نہیں بلکہ تواریخ عجیب کا نام کالا پانی ہے کیونکہ ایک حرف ''و'' کے اضافے سے سنہ اشاعت چھ سال آگے بڑھ جاتا ہے اور تواریخ عجیب میں بھی کالا پانی کی صعوبتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کالا پانی کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہابیوں نے کوئی کارروائی کی ہی نہیں ملاحظہ ہو:

''ان خودغرضوں نے ان سو دو سو فقیر ان ساکنان ملک غیر کا ڈر اور رعب ہماری ایسی بہادر اور دانا سرکار کے دل پر اتنا جمایا اور اس میں ایسا مبالغہ کیا کہ گویا سلطنت انگریزی کا قلع قمع کرنے والے یہی لوگ ہیں۔''

''ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی کتاب کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے کہ اس میں کیسے رسّی کا سانپ اور رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے۔''

''اس کتاب پر ڈاکٹر ہنٹر کا جادوانہ اثر ابھی تک اکثر انگریزوں کے دلوں پر ہے۔ جو وہابیوں کو اپنا جانی دشمن جانتے ہیں اور اگرچہ ابتدائے عملداری پنجاب سے افغانوں نے صدہا بڑے بڑے معزز انگریزوں اور میم اور بچوں کو بلکہ گورنر جنرل تک کو مار ڈالا اور ابھی تک جہاں موقع پاتے ہیں اپنی وحشیانہ حرکت سے باز نہیں آتے اور ان کے مولویوں نے عام فتوئی دے رکھا ہے کہ انگریزوں کا مارنا بڑا ثواب ہے۔''

''ابتدائے عملداری سرکار سے وہابیوں سے قتل انگریزی تو درکنار کبھی خلاف تہذیب (بات) بھی سرزد نہیں ہوئی۔ عین بغاوت 1857 کے عام فتنے کے وقت بجائے بغاوت اور فساد کے وہابیوں نے انگریزوں کی میم اور بچوں کو باغیوں کے ہاتھ سے بچا کر اپنے گھروں میں چھپا رکھا مگر ڈاکٹر ہنٹر کے جادو نے دونوں قوموں کے درمیان براہ تعصب سخت دشمنی اور نفرت کر رکھی ہے۔''

مولانا جعفر تھانیسری کا معاملہ کافی عجیب ہے۔ انھوں نے سوانح احمدی میں سید احمد شہیدؒ کے خطوط شائع کیے ہیں۔ ان خطوط کے متعلق خواجہ احمد فاروقی اور کلیم الدین احمد نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ دونوں متفق ہیں کہ جن حصوں میں انگریزوں کی طرف اشارہ تھا ان حصوں کو یا تو حذف کردیا گیا یا ان میں تحریف کردی گئی۔ مثلاً نصاریٰ نکوہیدہ خصال' کے بجائے ''سکھان نکوہیدہ خصال'' اور ''کفار فرنگ'' کو کاٹ کر ''کفار دراز مویاں'' کردیا گیا ہے۔ جہاں رنجیت سنگھ اور کمپنی لکھا تھا کمپنی کو حذف کردیا اور جہاں لاہور اور کلکتہ لکھا تھا کلکتے کو حذف کردیا گیا۔ جہاں عیسائیوں کی بدبختی اور ہندوستان پر قبضہ کرلینے کی بات ہے وہاں لمبے لمبے بالوں والے سکھ اور پنجاب کی بات کی گئی ہے۔

کلیم الدین احمد صاحب اس پر سخت تنقید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''یہ گویا تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ اس کی وجہ اخلاقی کمزوری ہو یا کچھ اور لیکن اسے سراہا نہیں جاسکتا۔'' (''اپنی تلاش میں'' ص-170، جلد اوّل)

''تذکرۂ صادقہ'' پر ''تاریخ عجیب'' کو تقدم زمانی حاصل ہے لہٰذا جابہ جا اس میں ''تاریخ عجیب'' کے حوالے ہیں۔ جو خامیاں جعفر تھانیسری کے یہاں موجود تھیں وہ ''تذکرۂ صادقہ'' میں بھی موجود ہیں۔ کلیم الدین احمد نہایت سخت گرفت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''تذکرۂ صادقہ'' کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل صادق پور نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ سب جو کچھ ہوا وہ ٹیلر کی بدمعاشی تھی۔'' واضح رہے کہ ولیم ٹیلر 1857 میں پٹنہ کا کمشنر تھا۔

مولانا جعفر تھانیسری کے نزدیک وہابیوں کا گروہ سو دو سو فقیروں پر مشتمل تھا جو کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں تھا یہ تو ہنٹر کی بدمعاشی تھی کہ اس نے ان بے ضرر فقیروں کو انگریزوں کا دشمن ثابت کردیا۔ ولیم ہنٹر Indian Musalman کا مصنف تھا اور اس کتاب میں اس نے وہابیوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔

''رسالۂ تعزیہ'' تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا۔ مجموعۂ رسائل تسعہ کا

ایک رسالہ ''رسالۂ بت شکن'' ہے جو تعزیہ داری کے خلاف ہے عین ممکن ہے کہ اسے ہی رسالۂ تعزیہ کہا جاتا ہو۔ ''ذرّ مقال'' بھی پٹنہ کی اہم لائبریریوں میں موجود نہیں ہوسکتا ہے کسی کی ذاتی لائبریری میں موجود ہو۔

بہر حال بات ہورہی تھی وہابی تحریک اور تصانیف کی۔ تحریک کا جو حشر ہونا تھا ہوا۔ ''تاریخ عجیب'' اور ''تذکرۂ صادقہ'' کی حیثیت وکیل صفائی کی بحث جیسی ہے۔ یہ میرا ذاتی نہیں بلکہ خواجہ احمد فاروقی اور کلیم الدین احمد کا موقف ہے۔ تاہم ایک بات تو طے ہے کہ یہ تحریک جب اٹھی، مذہب کے حوالے سے مقامی ثقافتیں اسلام کے مین اسٹریم پر بری طرح حاوی ہوگئی تھیں۔ ملنن سنگر نے ثقافت کے حوالے سے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ وہ ثقافت کے حوالے سے اصل ثقافت (Great Traditions) اور مقامی ثقافتوں (Little Traditions) کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں کچھ دیوی دیوتا تو ایسے ہیں جن کی حیثیت ہندوستان کے تقریباً تمام حصّوں میں مسلّم ہے۔ جیسے دُرگا دیوی۔ کچھ دیوی دیوتا ایسے ہیں جن کی حیثیت مقامی ہے مثال کے طور پر پٹنے میں ایک دیوی کا نام پٹن دیوی ہے جس کا ذکر صرف پٹنے کے گرد و نواح میں ہوتا ہے۔

مذہب کے حوالے سے بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ مذہب جہاں جاتا ہے اصل ثقافت کے طور پر جاتا ہے۔ جتنے جتنے اس میں مقامی ثقافتوں کا اختلاط بڑھتا جاتا ہے اور ایسی بھی صورت حال ہوسکتی ہے کہ مقامی ثقافتیں اصل ثقافت پر حاوی ہوجائیں۔ اسلام کے ساتھ ہندوستان میں یہی کچھ ہورہا تھا۔ وہابیوں نے اسے شرک و بدعت کا نام دیا اور کوشش کی کہ اسلام کی اصل شکل سامنے آئے۔ ابتدا میں انھیں کامیابی بھی ملی تاہم اس تحریک پر بھی مقامی ثقافتیں حاوی ہوگئیں۔ جیسا کہ اقتباس اوّل میں کہا گیا ہے، لوگ اس شخص کی قبر سے مرادیں مانگنے لگے جس نے ان رسوم کے خلاف تحریک چلائی تھی۔ خود سید احمد شہیدؒ کے بارے میں یہ افواہ گردش کرتی رہی کہ وہ شہید نہیں ہوئے، غائب ہوگئے ہیں۔ ان کی ذات سے کئی کرامات مشہور ہیں۔ کلیم الدین احمد نے ایسی چھ سات کرامتیں گنوائی ہیں اور لکھا ہے۔

''ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ امت بھی ''کرامات'' میں کھوگئی۔

(''اپنی تلاش میں'' ص-143، جلد اوّل)

وہابی تحریک کی ایک بڑی کامیابی یہ ہے کہ شرک و بدعات آج بھی موضوع بحث ہیں۔ شرک و بدعات غلط ہیں، یہ تقریباً سبھی مانتے ہیں جھگڑا تو اس بنا پر ہے کہ کون سے افعال شرک و بدعت کے دائرے میں داخل ہیں۔ اگر ایک گروہ کسی مخصوص فعل کو قرآن و حدیث کی رو سے بدعت قرار دیتا ہے تو دوسرا گروہ اسی فعل کو قرآن و حدیث کے حوالے سے درست قرار دیتا ہے۔ ☐☐☐

پتہ:
303 'B' Kalpataru, Bhagojee Keer Marg,
Matim (w) Mumbai-400016

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے یہ پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات پر، اس کے اثرات کا ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں نے بھی جائزہ لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 386، قیمت-/215 روپے

جدید — ہندی اردو لغت (۲ جلدوں میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید — ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دونوں جلدیں)، قیمت-/1640 روپے (دونوں جلدیں)

محمد افضل ملک

اقبال کی نظم "بزمِ انجم" کا تجزیہ

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں "تارے"
محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمھاری
رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے
حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

یہ نظم اپنے اندر مظاہر فطرت یا کائنات کی بزرگ و برتر قوتوں کا ایک ڈراما سمیٹے ہوئے ہے جس کے کردار سورج، شام، تارے، انسان وغیرہ ہیں، آفاق اس تمثیل کی اسٹیج ہے اور ملائک اس کے ناظرین ہیں۔ عرش کی یہ مخلوق حسنِ ازل کی جانب سے گویا سامعی کرنے Prompting کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ پھر انسان کو اس تمثیل میں شریک ہونے کی دعوت ملتی ہے اور وہ ناظر اور کردار دونوں روپ میں ابھرتا ہے تاکہ وہ اس شعور سے بہرہ ور ہو سکے کہ اصل زندگی صرف اسی صورت انسان کا مقدر بنتی ہے جب وہ المیہ کے ہیرو کی مانند آفاقی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائے۔ "بزمِ انجم" کے تمثیلی حصے کا کینوس نہایت وسیع ہے، اس تمثیل کا تعلق ہمارے Clock-time سے کہیں زیادہ Geological-time سے ہے۔ اس سطح پر تمثیل کا عرصہ قدروں کے ایک نظام کی شکست و ریخت سے قدروں کے نئے نظام کی تکوین تک کا ہے۔ اولاً اس میں انسان کو دعوتِ نظارہ اس لیے دی جا رہی ہے کہ وہ بھی ارضی وقت سے ماوراء ہونے کی سکت پیدا کرے اور لازماں ہو کر اس کائناتی تمثیل کا ایک حصہ بن جائے۔

ثانیاً کائنات اور انسان کی ہم آہنگی یا وحدت معرضِ وجود میں آسکے اور اس طرح انسان، مافوق الانسان کی سطح پر آ کر حقیقت ازلی سے متعارف ہو سکے، یوں بھی زندگی محض Clock-time کی تنگنائے میں مقید نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ یہ شعری تمثیل انسان کو قوتِ حیات پر ایمان لانے کے لیے دعوتِ عمل پر ابھارتی ہے۔ اس مختصر سی نظم میں المیہ تمثیل کے مماثل کئی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ المیہ قادرِ مطلق کے خلاف شکایت کا روپ پیش کرتا ہے۔ جب کہ یہاں رات کی ظلمتوں کے خلاف صف آرا ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے جو انسان کی طرف سے عزم و عمل کی مکمل آزادی کی خواہش کا شاعرانہ اظہار ہے۔

جس طرح المیہ تمثیل انسان کو وحدت کا تصور عطا کرتی ہے بالکل اسی طرح اس نظم میں بھی فطرت اور عام انسان کی ہم آہنگی نیز باہمی محبت اور ہمدردی کے مسلک کو اہمیت ملی ہے۔ نظم کے مقطع میں "جذبِ باہمی" کی ترکیب وحدت کے اسی مسلک کی طرف ایک اشارہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ المیہ کی طرح تقدیر کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی ایک درپردہ تڑپ بھی اس نظم میں موجود ہے۔

"بزم انجم" کا تمثیلی حصہ اپنے اندر غنائیہ ہیئت Symphonic form لیے ہوئے ہے اور یہ قاری میں بے پناہ تعمیری احساس اجاگر کرتا ہے۔ زندگی کے تجربے کا قائم مقام لفظ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نظم میں الفاظ فاعلی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، اس میں ہر لفظ مشیئت thingness سے متصف ہے۔ ہر شے جاندار نظر آتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقبالؔ کا رویہ اس نظم میں Animistic ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ میں جان موجود ہے۔

"بزم انجم" میں انسان کی فطری قوتوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کو بیدار کیا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبالؔ گرد و پیش کی اشیا سے قوتِ حیات کو خوب جذب کرنا جانتے ہیں۔ اس اسلوبِ فکر کو فلسفہ کی زبان میں معروضی تصوریت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں تصوریت، زندگی سے الگ تجریدی حیثیت کی حامل نہیں ہوتی بلکہ قوتِ حیات کے دوائر اور امکانات کو وسیع تر کرتی ہے۔ اس معروضی تصوریت کی اساس پر انسان ایک ابدی تحریک اور دائمی فعلیت کی حالتوں سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

معروضی تصوریت میں معروض اور موضوع حقیقتِ مطلق کے دو رخ ہیں۔ مادہ اور روح الگ الگ نہیں۔ حقیقت کے اس معروضی تصور کا ادراک کرنے سے انسان اور عالم امکان میں ایک عملی رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور انسان زندگی کی حرکت اور نئے نئے خارجی حالات سے موافقت پیدا کرنے کی صلاحیت اپنی داخلی ہستی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یوں وہ کائنات کی اصلی حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے اور فطرت کے عمل تغیر یا انقلاب کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے۔ چونکہ کائنات ابھی تک ناتمام ہے اور صدائے کن فیکون ہر لحظہ بلند ہو رہی ہے گویا عمل تخلیق جاری ہے جس میں انسان شریک ہے اس لیے "بزمِ انجم" میں اس عملِ تخلیق کے لیے انسان کو آفاقی سطح پر بلند ہونے کے لیے بیدار کیا جا رہا ہے۔

محو فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرش بریں سے آئی آواز اک ملک کی
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمھاری

فطرت اور انسان کی ہم آہنگی سے اقبال حقیقت کا ادراک اور حسن ازل کی کرشمہ زائیوں سے لطف اندوزی کی تحریک دیتے ہیں۔

نظم کے تصویری پیکر اور استعارے مثلاً غروبِ آفتاب، شام سیہ قبا، طشتِ افق، لالے کے پھول، سونے کے زیور، چاندی کے گہنے، محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت کا آنا، عروسِ شب کے موتی وغیرہ یہ سب کچھ مصوری کے نمونے ہیں جو شاعری کا ملبوس پہن کر سامنے آگئے ہیں۔ "سورج کا جانا" گویا زندگی کی روشن قدروں کے ایک نظام کا انحطاط پذیر ہونا ہے، چنانچہ اس رعایت سے "شام سیہ قبا" کا صوری پیکر شر کی قوت اور نراج کی ظلمت کا اظہار ہے "طشتِ افق" میں شاعر کی چشم بینا نے یکراں افق کو سمیٹ لیا ہے۔ اس کی تب و تاب میں رنگوں کی گھلاوٹ دیدنی ہے۔ "لالے کے پھول مارے" کی تصویر میں کمال مصوری پنہاں ہے، رنگوں کے اس حسین و جمیل تناظر میں بے پناہ فعالیت موجود ہے۔ رنگوں کی شام سیہ قبا کی تاریکی سے ہاتھاپائی اور پھر اس ظلمت پر غالب آنے کا عمل جاندار اور حقیقی ہے۔ اقبال کی اس نظم میں شامِ سیہ قبا کی تمثیل اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں شادی کا منظر نگاہوں کے سامنے ابھر آتا ہے۔ مثلاً طشت سے لالے کے پھول لے کر "شام سیہ قبا" کو مارنے کے عمل میں شادی بیاہ کی بعض رسموں کی طرف قاری کا ذہن باآسانی منتقل ہو جاتا ہے۔ پھر چاندی کے گہنے اور سادہ لباس اتار کر سونے کے گہنے اور بھڑکیلا لباس پہنانے کی بات بھی ایک عام سادہ لڑکی کو دلہن بنانے کے عمل ہی کی طرف ایک اشارہ ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار میں "محمل" اور "عروس" کے الفاظ اس ہنگامۂ شادی کی تصویر کو مکمل کر دیتے ہیں۔ گویا اقبال نے انتہائی فن کارانہ انداز میں کائنات کے تخلیقی عمل کو ارضی سطح کے تخلیقی عمل اور اس کے سارے پس منظر سے (جو شادی بیاہ کی رسوم پر مشتمل ہے) مربوط کر دیا ہے۔

تمثیلی حصے کی ابتدا سے ہی یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ کائنات کا تخلیقی عمل ہنوز تشنۂ تکمیل ہے بلکہ حسن ازلی نئی نئی صورتوں میں پیہم جلوہ گر ہو رہا ہے اور کائنات میں صدائے کن فیکون برابر بلند ہو رہی ہے۔ نظم میں "شب کے پاسبانو" کو یہ مژدہ دیا جا رہا ہے کہ وہ تمثیل کے دوسرے کرداروں یعنی "اہل زمین" کو بیدار کریں، اس مژدہ کے لیے لفظ "سرود" استعمال کیا گیا ہے کہ خوابیدہ انسان میں وہ قوتِ حیات بیدار ہو جائے جو اسے معروضی سطح سے بلند کرکے ازلی دورِ حیات سے بہرہ ور کر سکے۔ اور وہ اس برادری میں شامل ہو جائے جس میں ستارے بھی شریک ہیں۔

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں

نظم کا یہ حصہ بے حد فعال اور تعمیری احساس سے معمور ہے۔ اس مژدہ سے تمام عالم ایک بارگی گونج اٹھتا ہے، اس پس پردہ موسیقی سے جو ڈرامائی تحریک پیدا ہوئی ہے وہ خوابیدہ نوعِ انسانی میں تلاطم نو تخلیقی کرنے کی قوت سے لبریز ہے۔ اس میں "کن فیکون" کی بازگشت اور آواز کے زمانی و مکانی عمل ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور یہی اس نظم کا اہم ترین پہلو ہے۔

(بہ شکریہ اقبال ریویو، حیدرآباد، بہ حوالۂ اوراق، لاہور)

محمد شجاعت علی راشد

اردو ـــــ اکیسویں صدی میں

زبان صرف وسیلۂ اظہار ہی نہیں، بلکہ تہذیب کی شناخت کا ذریعہ بھی ہے اور اسی کے ذریعے سماجی روابط کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے مسائل اور معاملات سے باخبر ہوتے ہیں اور اسی باخبری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے روابط استوار ہوتے ہیں۔

زبان کی مختلف جہتیں ہوتی ہیں۔ مہد سے لحد تک زبان کا رنگ و آہنگ بدلتا جاتا ہے ابتدا میں بے معنی آوازیں تتلاہٹ کے ساتھ بہت کچھ بیان کر دیتی ہیں لیکن پھر جیسے جیسے انسانی شعور سن و سال کی چھاؤں میں پختگی کی حد تک پہنچتا ہے تو ہر شعبۂ حیات کی الگ الگ بول چال سے اس کا سابقہ پڑتا ہے مذہبی تقریب ہوتی ہے تو کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے، شادیانے بجتے ہیں تو الفاظ آتش بازی کی پھلجھڑی بن کر کچھ اور ہی رنگ پیدا کرتے ہیں اور پھر جب آخری لمحات آجاتے ہیں تو کچھ اور ہی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں۔

زبان الفاظ کے سہارے ہی اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ جس طرح انسانی جسم کا کوئی تصور اعضا کے بغیر ناممکن ہے اسی طرح الفاظ کے بغیر زبان کا تصور بھی ناممکن ہے اور جس طرح تمام اعضا انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔ اسی طرح اگر کسی زبان کے پاس اپنا رسم الخط نہیں ہے تو وہ زبان اس انسان کی طرح ہے جس کا سر نہ ہو۔ ہر زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔ اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں ہے اسے ایک معاشرے، ایک سماج اور ایک تہذیب نے اپنا خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا ہے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستان کی چھ سات سو برس کی تاریخ بھی ہے جو ہندوستانیوں کے مشترکہ دکھ سکھ کی تاریخ ہے۔ ہندوستانی قومیت کو اردو کی سب سے بڑی دین یہی ہے کہ اس نے تاریخ کو اس طرح اپنے دامن میں محفوظ رکھا جس طرح فانوس میں چراغ روشن رہتا ہے اور جس طرح صبح کے ستارے کی روشنی میں کارواں، بانگ جرس کے ساتھ مقامات طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اسی طرح اردو نے بھی ہمیشہ مستقبل کے لیے راہیں ہموار کیں۔

طویل عرصے تک اردو کو لشکر کی زبان کہا گیا۔ لیکن یہ لشکری زبان صرف لشکری زبان نہیں تھی۔ خانقاہوں میں حقیقت اور معرفت کے الوہی پیغامات کے نشر و اشاعت کا ذریعہ بھی یہی زبان تھی، بے شک صوفیائے کرام کی سرپرستی نے اسے علم و عرفان کے فروغ کا وسیلہ بھی بنا دیا، یہ کسی فرقے کی جاگیر نہ تھی، کسی مسلک کی پیرو نہ تھی اور کسی دھرم یا مذہب تک محدود نہ تھی اس میں اتنی قوت تھی کہ بعض دیگر زبانوں کی طرح یہ جغرافیائی حد بندیوں کی اسیر نہ رہی۔ اسی لیے ہندوستان کے شمال کو جنوب سے، مشرق کو مغرب سے ملانے کا کارنامہ اسی نے انجام دیا۔ یہ ہماری قومی وحدت کا سب سے بڑا نشان اور کثرت میں وحدت کی علامت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زبان پر 47 کے بعد برا وقت پڑا اور اس کا دائرۂ اثر سمٹنے لگا۔ مگر یہ پوری سچائی نہیں ہے۔

سچائی کیا ہے اسے جاننے کے لیے کچھ حقائق پر نظر کرنا ضروری ہے۔ 47 سے پہلے موجودہ بنگلہ دیش میں اردو بولنے والے خال خال تھے اب ڈھاکہ، چٹا گانگ گاؤں، جیسور، میمن سنگھ اور پاربتی پور میں اردو کے چھوٹے چھوٹے زون ہیں۔ پاکستان پر نظر ڈالیں تو بے شک لاہور اردو کا ایک مرکز تھا مگر کراچی میں اردو نہ تھی اب کراچی، پشاور، اسلام آباد ہو یا راولپنڈی، انھیں اردو کے مراکز کہا جاسکتا ہے۔ لاہور تو خیر پہلے بھی تھا آج بھی ہے اسی شہر اردو کے لیے کسی ستم ظریف نے کہا تھا

لاہور میں مخلصانِ اردو کس جوش سے آگے بڑھ رہے ہیں
حد ہوگئی خدمتِ زباں کی اردو میں نماز پڑھ رہے ہیں

آزادی سے پہلے ہمارے بزرگوں نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ لندن میں اردو کے مراکز اور تعلیم گاہیں قائم ہوں گی۔ امریکہ میں نیویارک، کیلی فورنیا، لاس اینجلس اور کئی دوسرے مقامات ہیں جہاں اردو کا چرچا ہے۔ سعودی عرب سے اردو کا اخبار نکلتا ہے۔ خلیجی ممالک میں اردو کا بول بالا ہے۔ اردو میں ایک عجیب و غریب انجذابی قوت ہے کہ یہ ہر زبان کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے۔ بقول احسن مارہروی ''دنیا کی کوئی زبان خواہ مغرب میں بولی جاتی ہو یا مشرق میں، شمال میں جاری ہو یا جنوب میں۔ ایسی نہ ملے گی جو اپنی مخالف زبانوں کے تمام لہجوں پر پوری طرح قادر ہوسکتی ہو۔ عجم (ایران) ٹ، ڑ، ڈ، ص، ض، ط، ظ، اور مخلوط ہائے ہوز کے بولنے میں گونگا ہے۔ عرب، پ، چ، ژ، گ پر زبان نہیں ہلاسکتا۔ انگلستان بھی غ، ژ اور ق نہیں بول سکتا۔ اسی طرح ہندوستان میں اردو کے سوا تمام پراکرتیں اپنا شین، قاف درست نہیں رکھتیں۔ یہ بات اردو ہی کے لیے مخصوص ہے کہ اجنبی سے اجنبی لہجے کی نقل کا اصل اتار لیتی ہے۔''

یہ نہ سمجھا جائے کہ میری نظر میں موجودہ دور میں اردو کو درپیش مسائل نہیں ہیں اظہار اثر'' اردو دنیا'' کے اپریل کے شمارے میں لکھتے ہیں''

''... اس وقت عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کم تھا اس کے باوجود اردو کے رسالے اور کتابیں پڑھنے والے لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ آج صرف دہلی کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کئی گنا بڑھ گیا ہے لیکن اردو کے قارئین ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا ہے۔ ایک بات اور بھی توجہ طلب ہے کہ دنیا کی کوئی زبان صرف ادب کے سہارے زندہ نہیں رہتی۔ ہر زمانے میں اپنی ساجیات، عمرانیات اور سوشل معاملات ہوتے ہیں۔ فلسفہ، سائنس، جغرافیہ، جیومیٹری، ریاضی یہ تمام علم مل کر ہی کسی زبان کو مکمل بناتے ہیں۔ صرف ادبی مباحثوں کے بل پر کوئی زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے جرائد کو صرف ادب تک محدود نہ رکھیں بلکہ ان تمام موضوعات کا احاطہ کریں جو ماضی سے مستقبل تک پھیلے ہوئے ہیں۔''

ان باتوں میں صداقت ہے۔ پیکر تصویر کا کاغذی پیرہن اب دھیرے دھیرے رخصت ہورہا ہے۔ انٹرنیٹ، ڈی وی ڈی اور سی ڈی وغیرہ کا اثر ہر زبان پر پڑرہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو ایک مخصوص تہذیب کے ساتھ وابستہ تھی وہ تہذیبی قدریں پس پشت جا پڑی ہیں۔ نتیجتاً ان تہذیبی قدروں کو فروغ دینے والی زبان پر بھی منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مادری زبان میں تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے طلبہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پاتے۔ نامساعد حالات کے باوجود اردو بھی سست روی سے تو کبھی تیز روی کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے۔ آئین ہند کے آٹھویں شیڈیول میں اردو کو بھی قومی زبان کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ 1956 میں ہندوستانی ریاستوں کی لسانی تقسیم کے بعد سے مختلف صوبائی حکومتوں نے اردو کو دی جانے والی سہولتوں پر عمل آوری کے لیے ہدایات جاری کیں جن کی روشنی میں پرائمری سطح تک کی تعلیم کی سہولت ان تمام بچوں کو دیے جانے کی ہدایت دی گئی جن کے والدین یا سرپرستوں کی مادری زبان اردو ہے۔ اردو میں اساتذہ کی تربیت اور نصابی کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ ثانوی سطح تک اردو ذریعۂ تعلیم کے لیے درکار سہولتوں کی فراہمی، نیز عدالتوں اور دفاتر میں درخواستوں کی اردو زبان میں قبولیت، اردو کے تمام علاقوں میں اہم قوانین، قواعد وضوابط اور اعلانات اردو میں جاری کرنے کی ہدایات بھی جاری کی گئیں۔ اردو زبان کو روزگار سے مربوط کرنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بعد سے یہ صورت حال اس قدر سنگین ہوگئی تھی کہ خود اردو والے روزگار کی عدم فراہمی کے خدشات کے سبب اردو میں درس وتدریس سے دوری اختیار کرنے لگے تھے۔

مختلف نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے اردو ایک زندہ زبان کی طرح پھلی پھولی ہے اور ترقی کی نئی منزلیں طے کررہی ہے۔ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے جو بلاشبہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے اردو نے دیگر زبانوں کے ساتھ مسابقت کی اور آج ایک زندہ زبان تسلیم کی جارہی ہے۔ لیکن ایثار اور جدوجہد کے بغیر کامیابی کے خواب دیکھنا محض خوش خیالی ہوگی۔ تعلیمی اداروں میں اردو زبان کی تدریس کے لیے سخت جدوجہد کی ضرورت ہے۔ پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو بحیثیت ایک مضمون پڑھنے اور پڑھانے کی کوشش ناگزیر ہے۔ عام طور پر جن شرائط کے ساتھ اردو کے فروغ کے لیے سہولتیں دینے کا اعلان کیا جاتا ہے وہیں سے دشواریاں بھی حائل کی جاتی ہیں لہٰذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں جہاں اور جس سطح پر حکومت نے اردو کو فروغ دینے کا اعلان کیا ہے وہاں وہاں ان احکامات پر عمل آوری کو یقینی بنائیں۔

1998 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم بالخصوص پیشہ ورانہ اور عصری تعلیم کے جو نئے امکانات نظر آرہے ہیں وہ انتہائی حوصلہ افزا ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جو کل ہند دائرۂ اختیار کی حامل مرکزی یونیورسٹی ہے اپنے منشور کے مطابق اردو ذریعۂ تعلیم کے توسط سے اعلیٰ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی اور روایتی اور فاصلاتی دونوں طریقوں سے چلائے جانے والے تعلیمی پروگراموں کے ذریعے اردو کے فروغ میں کوشاں ہے۔ اردو فاصلاتی تعلیم نے بڑی حد تک فضا بدلی ہے۔

آیئے تعمیری اور مثبت انداز میں کوشش کریں کہ یہ زبان صحیح تلفظ اور درست قواعد اور اپنے حسن بیان کے ساتھ فروغ پائے اور ہم کہہ سکیں:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

□□□

پتہ:
Deputy Director and Incharge
Markaz Barae Urdu Zaban,
Adab-o-Saqafat,
MANUU, Hyderabad

سلیمان اطہر جاوید

اردو زبان — نئے افق

اردو یونیورسٹی ایک خواب تھا، جس کی تعبیر سامنے آچکی ہے، آزادی کے بعد ہندوستان کے تعلیمی اداروں بالخصوص جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کے خاتمے سے اردو والوں پر مایوسی اور پژمردگی کی فضا طاری تھی اور ان کا اپنی زبان کے مستقبل سے اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ اردو مخالف طاقتوں نے کچھ ایسی فضا پیدا کردی تھی کہ مستقبل تاریکیوں کے حوالے ہوتا محسوس ہوتا تھا اور بقول مخدوم محی الدین ایسا لگتا تھا کہ:

وہ زباں جس کا نام ہے اردو
اُٹھ نہ جائے کہیں خوشی کی طرح

لیکن تاریکیاں مٹتی گئیں، دھند لکے چھٹتے گئے۔ مخالف طاقتوں کی کوششیں لاحاصل رہیں۔ اور اب اردو نئی تابندگی اور پائندگی کے ساتھ وطن عزیز کی ایک مقبول زبان کی حیثیت سے چمک رہی ہے۔

اس دوران میں اردو کے حق میں جو ہوا اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ترقی اردو بورڈ (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کئی ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام، بعض ریاستوں یا ریاستوں کے اضلاع میں اردو کو سرکاری زبان کا موقف دیا جانا اردو مدارس کی بنیادوں کو مستحکم بنانے کی مساعی اور بھی بعض اقدامات۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو والوں میں اب وہ مایوسی اور ناامیدی کی فضا نہیں جو کبھی تھی۔ ایسے میں جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کے خاتمے کے نصف صدی بعد ہی سہی 1998 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام اردو والوں کے لیے مژدۂ جاں فزا سے کم نہیں تھا اس یونیورسٹی کے قیام سے اردو اور اردو والوں نے گویا ایک حیات نو پائی۔ محسوس ہوا جیسے کسی نے سوکھے ہوئے پیڑ کی آبیاری کی ہو، وہ ایک انگڑائی لے کر لہلہانے لگا ہو۔

داغ دہلوی نے کبھی کہا تھا: ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ لیکن آج سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں محدود پیمانے پر سہی اردو کی تعلیم و تدریس کی چہل پہل ہے۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں کی آن بان تو کچھ اور ہی ہے۔ بعض نئی بستیوں سے اخبارات اور رسائل و جرائد بھی شائع ہو رہے ہیں۔ عالمی اردو کانفرنسیں لندن اور شکاگو وغیرہ میں منعقد ہو چکی ہیں۔ اس بار عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد جدہ جیسے مقدس شہر میں عمل میں آیا جس کو باب الحرمین بھی کہا جاتا ہے کہ مکۂ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو جانے والے براہ جدہ ہی جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جدہ شہر اردو بھی ہے۔ بازاروں میں دکانات کے نام اور ہدایات اردو میں بھی ملتی ہیں مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی اعلانات اور ہدایات اردو میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ چلتے پھرتے، آس پاس اردو بات چیت آپ کی سماعت پر خوش گوار اثرات مرتب کرے گی۔ سعودی عرب کے دوسرے شہروں، ریاض، دمام اور تبوک وغیرہ میں بھی یہی لسانی منظر نامہ ملے گا۔

6 اور 7 جون 2008 کو انٹرنیشنل اسکول جدہ میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ کانفرنس میں ایسے موضوعات پر بھی مقالے پڑھے گئے جن پر قبل ازیں کہیں نہ کہیں غور کیا جا چکا ہے اور ایسے موضوعات پر بھی جن پر نئے مناظر میں غور کرنے کی گنجائش ہے۔ اردو تدریس، اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کو ذریعہ بنانا، دینی جامعات، تعلیم نسواں، اردو کے فروغ اور اشاعت میں میڈیا کے کردار، ترجمے کے مسائل، اردو زبان کے مسائل، معاشرے میں اردو کا کردار، عصری تقاضے اور اردو کی ترقی میں صحافت کا حصہ اور ایسے ہی موضوعات کے علاوہ ریاض، سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ میں اردو کی تعلیم کے امکانات۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا:

''اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی کمائی ہے۔ ایسی کمائی جس سے کوئی انصاف پسند نظر نہیں چرا سکتا۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اردو محض زبان نہیں ایک طرز زندگی، ایک اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے اور شکل دی ہے جسے ہم آج اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سیر حاصل پیرائے میں رسم خط کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے پروفیسر نارنگ، پروفیسر فتح محمد ملک، عزیز احمد، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

''اردو رسم خط، اردو کی آن بان اور شان ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کی پہچان بھی ہے۔ اس کا رشتہ اردو ادب سے جسم اور جلد کا رشتہ ہے اس میں صدیوں کی ادبی، علمی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی اقدار کی نمائش ہے اسی کی مدد

سے ہم میڈل ایسٹ اور ایشیا کے کئی ملکوں سے لسانی رشتے قائم کر سکتے ہیں۔"

نجم السحر، امام اعظم، محمد احسن، ظفر علی نقوی، ایس. ایم. رحمت اللہ اور نعیم جاوید نے اردو کے مسائل کو خصوصی طور پر موضوع بنایا اور سعی کی کہ ان مسائل کا کما حقہ احاطہ کریں۔ یہ مسائل۔ صاف اور سادہ بھی ہیں اور الجھے ہوئے اور پیچیدہ بھی، امام اعظم نے حکومتوں کی لسانی پالیسیوں سے متعلق مسائل، تدریس کے مسائل اور اردو کی آموزش کے مسائل پر دوٹوک اور صاف صاف گفتگو کی۔ ڈاکٹر نجم السحر نے اسکول کی سطح پر اردو زبان کی تدریس کے مسائل پیش کرتے ہوئے جن تجاویز کی طرف توجہ دلائی، متعلقہ ذمے دار افراد اور اداروں کو ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو زبان کی توسیع و ترقی اور اردو تعلیم و تدریس کی بہتری اور اصلاح کے لیے جن اصحاب نے اپنے مقالوں میں تجاویز پیش کیں ان میں محمد احسن، سید جمال اللہ قادری، ظفر علی نقوی، سمیرہ عزیز اور علیم خاں فلکی کے مقالے اہمیت رکھتے ہیں۔ سمیرہ عزیز نے اردو طریقۂ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے تجاویز پیش کرتے ہوئے کھری کھری بھی سنا دی۔ ان کے مقالے کا ایک اقتباس ہے:

"اردو پر ظلم سب سے زیادہ خود اردو والے کر رہے ہیں۔ ماہرین اردو کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ادبی نشستوں میں اردو کی ترویج و ترقی کے اوپر پُر مغز اور مدلل تقاریر کرتے نہیں تھکتے مگر خود اپنے گھروں میں اپنی نئی نسل کو انگریزی بولنے کی ترغیب دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ادبی تنظیمیں سالانہ مشاعرے اور سیمینار کروا کر یہ سمجھ لیتی ہیں کہ اردو کا حق ادا ہو گیا۔"

حسام الاسلام صدیقی نے بھی اس تلخ حقیقت کی طرف توجہ دلائی:

"تھوڑی تلخ بات ضرور ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اردو کو اصل خطرہ تو انھی سے ہے جنھیں اردو والا تصور کیا جاتا ہے جو اردو کی روٹی کھاتے ہیں... میں نام لینا نہیں چاہتا لیکن بخوبی واقف ہوں کہ ہمارے ملک کے درجنوں ایسے لوگ جنھوں نے ہمیشہ اردو کی روٹی کھائی، اردو اوڑھی اور بچھائی، اور اردو کے ذریعے ملک گیر پیمانے پر اور بیرون ملک تک میں شہرت حاصل کی انھوں نے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دی۔ کئی بڑے اردو اخبارات کے مالکان و مدیران کے بچے اردو نہیں جانتے۔"

ڈاکٹر محمد احسن کے لہجے میں ہر چند کہ ایسی تلخی نہیں تھی لیکن انھوں نے بھی اس تلخ حقیقت کو برافگندہ نقاب ضرور کیا۔ انھوں نے کہا:

"اردو تعلیم کی پسماندگی اور بدحالی کا تعلق سرکاری افسران کے تغافل اور خود ہماری عدم سنجیدگی سے ہے۔"

کانفرنس میں جو تجویزیں پیش کی گئیں، ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جن پر عمل کی صورت ممکن نہیں دکھائی دیتی لیکن زیادہ تر تجاویز ایسی ہیں کہ ان کو روبہ عمل لانے کی ذمے داری اردو والوں پر بھی ہے اور حکومت پر بھی۔ ارباب اقتدار کو بہرصورت چاہیے کہ وہ ایک بڑی لسانی اقلیت کے مسائل کو حل کرنے کی طرف قدم بڑھائیں۔ جمہوری مملکت میں جمہوریت کو کامیاب اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ مذہبی اور تہذیبی ہی نہیں لسانی اقلیتیں بھی محفوظ اور مطمئن ہوں۔ میں یہاں پروفیسر رحمت اللہ کے مقالے کی سمت توجہ دلاؤں گا جس میں انھوں نے اردو والوں کے علاقے میں اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس اور کالجوں کے قیام، اردو ذریعۂ تعلیم کے فروغ کے لیے طالب علموں کو مختلف نوعیت کے ترغیبی انعامات دینے اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز، روزگار سے مربوط فنی پیشہ ورانہ کورسز، اردو میں تمام مضامین کی اصطلاحات اور نصاب کی معیاری کتب کی تیاری اور مقامی زبان اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کے مدارس اور کالجوں میں اردو بحیثیت اختیاری مضمون پڑھانے اور مختلف مضامین کے اساتذہ کے تقرر پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر نکہت جہاں نے اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی سرگرمیوں اور اس کی کارکردگی کا معروضی طور پر جائزہ لیا۔ انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کے علاقائی مرکزوں میں مختلف کورسز کا آغاز کیا گیا اور تعلیم نسواں پر بھی خصوصی توجہ دی گئی، انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، میکانک اِن الکٹرانکس، ایرکنڈیشننگ اور ریفریجریشن کے علاوہ میکانک اور الکٹرانک ٹریڈ میں سرٹیفکیٹ کورسز شروع کیے گئے اور مستقبل میں ڈپلوما ان لیب ٹکنالوجی اور پیرامیڈیکل کورسز شروع کرنے کا یونیورسٹی ارادہ رکھتی ہے۔

اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کو بھرپور اور پوری طرح کارکرد ہونا چاہیے۔ اس شعبے کی ترقی کے خاصے امکانات ہیں۔ پروفیسر ظفر الدین نے ترجمے کی ٹکنالوجی، مشینی ترجمے، ترجمے کے عمل، انسانی تراجم، بہ مقابلہ مشینی تراجم، مشینی ترجمہ اور کمپیوٹر اعانتی ترجمہ، مشینی ترجمے کے عمل، مشینی ترجمے کے مختلف استعمال اور اس کی کامیابیوں اور مستقبل میں مشینی اردو ترجمے کے امکانات کو واضح کیا۔ ظفر الدین اس موضوع پر کتاب لکھیں تو اس کا مزید حق ادا کر سکتے ہیں۔ ترجمے کے تعلق سے بین الاقوامی تناظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"مشینی ترجمے کے عمل نے تمام زبانوں کے ماہرین کو اس بات پر غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر لسانی ہم آہنگی موجودہ دور کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے کم از کم بعض نکات پر تو زبانوں میں اشتراک اور ہم آہنگی کے بغیر مشینی ترجمہ ناقابل عمل بن جاتا ہے۔"

اردو یونیورسٹی کے منشور اور مقاصد میں تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ کرنا شامل ہے۔ یونیورسٹی کا مرکز برائے مطالعات نسواں اس کا مظہر ہے کہ ارباب اقتدار تعلیم نسواں سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس مرکز کی پروفیسر ریحانہ

سلطانہ ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں دینی جامعات، تعلیم نسواں اور فروغ اردو سے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں بتایا کہ فروغ اردو کے سلسلے میں دینی مدارس کا کردار کس قدر مثبت ہے۔ ڈاکٹر نکہت جہاں اور ڈاکٹر وہاب قیصر نے بھی اردو یونیورسٹی میں تعلیم نسواں کی صورت حال اور مستقبل میں خوش آئند امکانات کا جائزہ لیا۔ پروفیسر وہاب قیصر کا مضمون اس زاویے سے بھی اہم تھا کہ انھوں نے اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے منظرنامے کو سامنے لاتے ہوئے اعداد و شمار کی روشنی میں حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے آرٹس اور کامرس کے علاوہ دیگر مضامین مثلاً ماس کمیونی کیشن، تعلیم نسواں، ترجمہ، انفارمیشن ٹکنالوجی اور بی.ایڈ اور ایم.ایڈ وغیرہ کے امکانات پر بھی معروضی انداز میں روشنی ڈالی۔

پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ہماری زندگی اور معاشرت پر اثرات نہایت گہرے ہیں۔ اردو زبان، تعلیم و تدریس اور شعر و ادب پر بھی میڈیا نے جو اثرات مرتسم کیے ہیں ان کی روداد طویل ہے۔ ہوسکتا ہے بعض منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہوں لیکن اثباتی اثرات کیفیت اور کمیت دونوں زاویوں سے آسانی سے شمار میں نہیں آئیں گے۔ معصوم مرادآبادی، مہتاب قدر، سراج وہاب اور بعض دیگر حضرات نے میڈیا کی ماہیت اور حقیقت ہی کو اجاگر نہیں کیا اس سے اردو زبان و ادب کے تال میل پر بھی روشنی ڈالی۔ فی زمانہ، اردو اپنے بساط بھر میڈیا کی سہولتوں سے استفادہ کررہی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ مزید استفادے کی گنجائش موجود ہے۔ اردو کے فروغ اور اشاعت میں میڈیا ایک جدید ترین اور زوداثر وسیلہ ہے اس سے اخذ و استفادے کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے ''اردو۔ اکیسویں صدی کی آواز'' کے عنوان سے اردو کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالتے ہوئے مستقبل کے لیے اس کی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم، خاص طور پر پیشہ ورانہ اور عصری تعلیم کے نئے امکانات اور نئے افق نظر آرہے ہیں چنانچہ وہ نہایت پرامید لہجے میں کہتے ہیں تعلیمی سطح پر اردو کا رواج گجرال اور سچر کمیٹی کی سفارشات پر مکمل عمل آوری کی صورت میں ممکن ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم اور ڈاکٹر محمد احسن نے بھی گجرال کمیٹی اور سچر کمیٹی کی سفارشات پر اظہار خیال کیا۔

ان مضامین کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ ان سے سعودی عرب، دوحہ، قطر اور مجموعی طور پر مشرق وسطیٰ میں اردو کے تعلیمی اور تدریسی موقف پر روشنی پڑتی ہے اور ان علاقوں میں تارکانِ وطن کی اپنی زبان سے محبت کا اظہار ہوتا ہے، نئے علاقوں میں اردو کے خدوخال سامنے آتے ہیں اور اردو کو وہاں جن نشیب و فراز کا سامنا ہے اور جن شب و روز سے وہ گزر رہی ہے اس کی بھی آئینہ داری ہوجاتی ہے۔

□□□

پتہ:
Ex President, Deptt. of Urdu,
S.V. University,
Tirupati

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی.آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت-/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی.کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت-/149 روپے

آفاق عالم صدیقی

زبان وادب کی تدریس کے مسائل

زبان کی ترقی وترویج کے سلسلے میں سب سے مؤثر طریقہ زبان کی تعلیم و تدریس اور روزمرّہ گفتگو میں اس کا استعمال ہے۔ زبان کی تدریس کا کام آسان نہیں ہے اور سچ پوچھیے تو روزمرّہ استعمال میں زبان کی صحت وصفائی کا خیال رکھنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ زبان کی تدریس اپنی جگہ ایک آرٹ ہے۔ جس میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔

تعلیم وتدریس ایسا عمل ہے جس میں معلّم متعلم کو اس طرح تعلیم دیتا ہے کہ متعلم اسے ذہن میں محفوظ رکھنے اور حسب ضرورت استعمال کرنے پر قادر ہوجائے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ تعلیمی عمل کا انحصار سات چیزوں پر ہے۔ (1) علم (2) معلم (3) متعلم (4) طریق تعلیم (5) ادراک (6) یادرکھنے کی صلاحیت (7) استعمال۔ ان چیزوں کی یکجائی اور مناسب اشتراک کے بغیر تعلیم وتدریس کا عمل جاری نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ متعلم تک علم پہنچانے کے عمل میں بھی کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ مثلاً تقریر، تحریر، مطالعہ، اعادہ، تکرار، توضیح۔ بحث وتنقید وغیرہ۔ اچھے اور ماہر اساتذہ اپنے تدریسی عمل کو مؤثر بنانے کے لیے تمام چیزوں کا استعمال کرتے ہیں۔

زبان وادب کی تدریس دوسرے مضامین کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔ مگر لوگ اسے آسان سمجھتے ہیں۔ زبان کسی ملک وقوم کے ضمیر کی آواز۔ اس کا دماغ۔ اور اس کی ثقافت کا چہرہ ہوتی ہے۔ زبان ملک میں اتحاد پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے زبان کی تعلیم پر خصوصی توجہ ضروری ہے۔

ہندوستان میں واضح طور پر تعلیم کے تین مدارج ہیں۔ (1) ابتدائی (2) ثانوی (3) اعلیٰ، شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر ابتدائی سطح پر زبان کی تدریس مؤثر انداز میں ہوجائے تو پھر اعلیٰ تعلیم تک کی راہ آسان ہوجائے گی۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ عموماً ابتدائی تعلیم کے لیے اساتذہ کے تقرر میں لاپرواہی برتی جاتی ہے اور ایسے لوگوں کو استاد مقرر کردیا جاتا ہے جنھیں زبان کی اہمیت اور تدریس کی نفسیات کا کوئی خاص شعور نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ طلبہ اعلیٰ سطح کی تعلیم حاصل کرلینے کے بعد بھی زبان وبیان پر مکمل قدرت حاصل نہیں کرپاتے ہیں۔ ان دنوں اردو زبان سے متعلق کئی طرح کی غلط فہمیاں بھی عام ہیں۔ مثلاً یہ زبان اعلیٰ تعلیم کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ یہ کوئی منطقی اور قائم بالذات زبان نہیں ہے بلکہ کئی زبانوں کا آمیزہ ہے وغیرہ۔ ان غلط فہمیوں کا ازالہ اردو زبان کے اساتذہ بہ طریق احسن کرسکتے ہیں۔ مگر ایسا ہونہیں رہا ہے۔ اردو دنیا کی واحد زبان ہے جس کا ماہر دنیا کی کسی بھی زبان کے الفاظ کا درست تلفظ کرسکتا ہے۔ اردو نے چونکہ دنیا کی کئی زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے اس لیے اس کی ایجابی صلاحیت بھی سب سے بڑھی ہوئی ہے اور دنیا کی کئی بڑی زبانوں کی خوبیوں سے مزین ہے۔ اس لیے اردو کے حوالے سے کسی بھی طرح کے احساس کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اردو حرف تہجی میں عربی، فارسی اور ہندی کے بھی کئی حروف شامل ہیں۔ ترکیب حروف کے لحاظ سے بھی اردو کی جامعیت مسلّم ہے۔ اور وہ تمام سہولتیں اس میں یکجا ہوگئی ہیں جو انفرادی طور پر عربی، فارسی اور ہندی میں پائی جاتی ہیں۔ کسی زبان کی مقبولیت میں اس زبان کے رسم الخط کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔'' رسم الخط کے مکمل ہونے کے لیے چار چیزوں کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اوّل زبان کی ہر آواز کے لیے ایک مخصوص نشان، دوم، ہر آواز کی واضح ادائیگی، سوم، رسم الخط کی خوبصورتی، چہارم اس کا آسان ہونا۔ اس معیار پر بھی اردو زبان پوری اترتی ہے۔ اردو کی تحریری خوبی یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کی کسی بھی زبان سے کم جگہ گھیرتی ہے۔ اس کے باوجود اگر اس زبان کی مقبولیت گھٹ رہی ہے اور اس کے پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں تو اس کی بہت سی وجہوں میں سے ایک اہم وجہ اساتذہ کی اپنے فرائض سے عدم دلچسپی اور ناقص تعلیم و تدریس ہے۔

زبان کی تدریس کے لیے یہ ضروری ہے کہ استاد زبان کا ماہر ہو۔ اور طریقۂ تدریس سے پوری طرح واقف ہو۔ اردو زبان کی تدریس کے لیے اردو لسانیات کے ساتھ، اسباق کی تیاری کے لیے ادبا وشعرا کے حالات زندگی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ بولنے کے عمل میں جو اعضا کام کرتے ہیں ان اعضا مثلاً ہونٹ، زبان، جوف دہن، تالو، دانت، حلق، ناک، زیریں جبڑا اور حنجرہ وغیرہ کے اشتراک عمل سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔

بہ ظاہر بولنے کا عمل بڑا معمولی اور غیر اہم معلوم ہوتا ہے، مگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس عمل میں توجہ، دلچسپی کے لیے دماغی خلیوں میں ہیجان، قوت حافظہ کا تحرک، سابقہ خیالات، تاثرات اور تجربات کے زیر اثر قوت ممیزہ کا عمل اور ردِعمل جیسی بہت سی چیزوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔

بولنے کے عمل کو کمزور کرنے والی بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں۔ مثلاً اکتاہٹ، بیزاری، دباؤ، ذہنی تکان، ناگوار احساسات، احساس کمتری، خوف،

غصہ، کوئی شدید جذبہ، جھجک یا کوئی غلط عادت وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اساتذہ ان چیزوں سے واقف ہوں گے تو طلبہ کی بہتر طور پر تربیت کرسکیں گے اور ان کی خامیوں کو دور کرکے ان میں نیا ولولہ اور جوش پیدا کرسکیں گے۔

مطالعے کی نفسیات کے ضمن میں مطالعے کے مقصد کا تعین، الفاظ کا ادراک، ذہنی تحریک، نکات مختلفہ کا ادراک اور عبارت کے اصل مفہوم تک رسائی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان باتوں پر عموماً اساتذہ توجہ نہیں دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایم ایڈ، بی ایڈ، اور ڈی ایڈ میں بلند خوانی اور خاموش مطالعے وغیرہ کو میکانکی انداز میں دہرا کر آئے ہوئے ہوتے ہیں۔

تحریر کی نفسیات کے ضمن میں بھی کئی چیزوں کا علم ضروری ہے۔ تحریر عموماً تین قسم کی ہوتی ہے اور تینوں اقسام کی تحریر کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ تحریر کی پہلی قسم کو نقل کہا جاتا ہے۔ یعنی دیکھ کر لکھنا، دوسری قسم کو، املا کہا جاتا ہے۔ یعنی سن کر لکھنا۔ تیسری قسم کو تخلیق کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی اپنے ذہن سے لکھنا۔ دیکھ کر لکھنے میں چار اہم نکات ہوتے ہیں: الفاظ کی شکل کا جائزہ۔ الفاظ کا بصری حسن، الفاظ سے پیدا ہونے والا ردِ عمل اور تحریری نقوش۔ سن کر لکھنے میں الفاظ کی شکل کا سماعی تصور نیز سماعی اور بصری تصور کا باہم ربط وغیرہ۔ تخلیقی تحریر میں کچھ دوسری چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً خیال کی نمو، الفاظ کا انتخاب، اور ذہنی عمل اور تخیل کی پرواز کے مطابق ہاتھ کی جنبش وغیرہ۔

اگر ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر طلبہ کی تعلیم وتربیت پر محنت کی جائے گی تو میں سمجھتا ہوں اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے مایوس کن نتائج کا بڑی حد تک ازالہ ہو جائے گا۔

ہائی اسکول اور انٹر کی سطح پر طلبہ میں اردو زبان وادب سے متعلق تساہل اور عدم دلچسپی کا جو رویہ پایا جاتا ہے اور ڈگری کی سطح پر جو ایک قسم کا ٹھہراؤ اور اکتاہٹ پائی جاتی ہے اس پر بھی تعلیمی اور تدریسی عمل میں جدت اور کشش پیدا کرکے قابو پایا جاسکتا ہے۔

ہائی اسکول اور انٹر بلکہ ڈگری سطح پر بھی ایک بات جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ کہ طلبہ کلاس روم میں اپنی دلچسپی کا بھرپور اظہار نہیں کرتے۔ عموماً کلاس سے غائب رہتے ہیں جو حاضر ہوتے ہیں انھیں بھی دیکھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ گھنٹے بھر کی قید کاٹنے کے لیے تن بہ تقدیر بیٹھے ہیں۔ انٹر کی سطح تک اگر اساتذہ چند چیزوں پر دھیان دیں تو طلبہ میں دلچسپی پیدا ہوسکتی ہے۔ مثلاً۔

تدریسی عمل اور کلاس روم کے ماحول کو روزمرّہ زندگی سے مطابقت دی جائے۔

● جہاں تک ممکن ہو تصویروں اور واقعات وامثال کے ذریعے تدریسی موضوع کا تصور طلبہ کے ذہن نشین کرایا جائے۔

● تدریس زبان کے ہر مرحلے میں زبان کی صحت پر توجہ مرکوز رہے۔

● طلبہ کو انفرادی طور پر بھی کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

زبان کی تعلیم وتدریس جب روزمرّہ کے مطابق ہوگی تو طلبہ کی دلچسپی بڑھے گی اسی طرح جب انھیں لکچر سننے کے بجائے عملی طور پر کچھ کرنے کا موقع ملے گا تو وہ میکانکی تدریسی فضا سے نکل کر آزاد تخلیقی فضا میں سانس لے سکیں گے اور ان کی اختراعی اور تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

یہ ضروری ہے کہ طلبہ میں شہ پاروں کے مطالعے کا ذوق وجذبہ پیدا کیا جائے، ثقافتی حسیت اور ذوقِ سلیم کی نشوونما کی جائے، اردو زبان کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر سے انھیں باخبر کیا جائے، بہت اچھی، کم اچھی اور بری تحریروں میں امتیاز کی حس طلبہ میں پیدا کی جائے اور ان میں نجی طور پر غور وفکر کرنے کی عادت کو بڑھاوا دیا جائے۔

موجودہ تعلیمی صورت حال میں میٹرک اور انٹر کی سطح پر ان مقاصد کا حصول کچھ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔ بشرطیکہ اساتذہ ان مقاصد کی تکمیل کا عہد کرلیں۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر آپ زبان کے ماہر ہیں، اس کے قواعد، طرز، اسلوب اور اس کی نزاکتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تقریر وتحریر کی نفسیات اور طلبہ کی جبلت کا شعور رکھتے ہیں مگر ایک واضح مقصد اور منصوبے کے تحت ان کی ترسیل طلبہ تک نہیں کرتے تو آپ کا علم بے سود ہے۔ زبان کی تدریس کے لیے زبان کی مہارت کے ساتھ طریقۂ تدریس سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

یہاں اس بات کا اعادہ غیر ضروری نہیں ہوگا کہ ہر مضمون کا طریقِ تدریس مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ مشترک بھی ہوتا ہے۔ میں یہاں تدریس نظم کے تناظر میں چند باتیں عرض کروں گا۔

نظم کی تدریس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالب علم نظم کو موثر انداز میں پڑھ کر اس سے لطف اندوز ہو اور ان جذبات سے متاثر ہو جن کو شاعر کی جذباتی طبیعت نے اشعار میں پیش کیا ہے۔ موثر پیرائے میں پڑھنے کے لیے نظم خوانی ضروری ہے اور لطف اندوزی اور تاثر پذیری کے لیے اشعار کی تفہیم ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر اشعار کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا تو ان سے حظ بھی نہیں اٹھایا جاسکے گا۔ درسی کتابوں میں عموماً جو نظمیں شامل ہوتی ہیں وہ تخیلی، بیانیہ، حکائی، قومی اور اخلاقی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ تخیلی نظم کی تمہید میں نظم کے اساسی موضوع سے متعلق امور کا ذکر ہونا چاہیے۔ حکائی نظم کی تمہید میں نظم کا خاکہ مختصر طور پر پیش کرنا چاہیے۔ قومی نظم میں اس واقعے کا پس منظر دکھانا چاہیے جس سے متاثر ہوکر شاعر نے نظم کہی ہے، اخلاقی نظم کی تمہید میں اس شعبۂ اخلاق پر مختصر بحث ہونی چاہیے جس کے متعلق شاعر نے اظہار کیا ہے، غزل کے سلسلے میں تمہید، شاعر کی سوانح اور اس کی شاعرانہ خوبیوں اور تخلیقی اساس پر مبنی ہونی چاہیے، اور کچھ غزل کی نوعیت سے متعلق بھی ذکر ہونا چاہیے۔ مثنوی کے باب

میں تمہید کے طور پر اس سیاق وسباق کی وضاحت کرنی چاہیے جس سے قصے کو ربط ہو۔ رباعیات کی تمہید میں شاعر کی سوانح اور رباعیات کے اساسی خیالات کا ذکر ہونا چاہیے۔ ہر قسم کی نظم کی تمہید میں نظم کی خوبیوں کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اسی سے طلبہ میں نظم خوانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ لطف اندوزی کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

استحضار نظم میں پہلے مدرس نظم کو ایسے پیرائے میں پڑھے کہ طلبہ متاثر ہوں۔ اس کے بعد طلبہ سے نظم خوانی کرائی جائے اور اس بات پر پوری توجہ دی جائے کہ وہ وزن اور قافیہ وردیف کا خاص خیال رکھیں۔ آہنگ کو بھی نظر انداز نہ کریں اور الفاظ کو ایسے انداز میں ادا کریں کہ مفہوم واضح ہو جائے۔ اس سلسلے میں طلبہ سے جو بھی غلطی ہو توجہ دلا کر اسے درست کیا جائے۔ مگر دوران نظم خوانی طلبہ کو ٹوکا نہ جائے۔ اصلاح تلفظ کے بعد تفہیم اشعار کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ مرکبات ومحاورات اور تلمیحات کی توضیح طلبہ کے تعاون سے کی جائے۔ توضیح کی بنا سوال وجواب پر رکھی جائے۔ مرکبات ومحاورات کی تحلیل صرفی وترکیب نحوی ضرورت کے مطابق واضح کی جائے، لفظی اور ترکیبی مشکلات دور ہو جائیں تو اشعار کی تشریح کر دی جائے، اشعار کی تشریح کے سلسلے میں چار چیزوں پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اول مرکزی خیال معلوم کرنے کے لیے مناسب سوال کیے جائیں۔ دوم اشعار کے لفظی مفہوم کے بارے میں دریافت کیا جائے۔ سوم لفظی مفہوم اور مرکزی خیال کے مدنظر شعر میں پیش کردہ تخیل کی وضاحت کرائی جائے۔ چہارم تشبیہات و استعارات کی وجہ اور غرض واضح کرائی جائے اور موزونیت الفاظ کی بحث مترادفات سے مقابلہ کراتے ہوئے کرائی جائے۔ شعر میں اگر تلمیحی اشارہ ہو تو اصل واقعہ کے ذکر کے بعد مرکزی خیال اور مفہوم شعر یا مفاہیم اشعار سے اس کے ربط کو واضح کیا جائے۔

استحسان نظم میں شاعر کے انداز بیان کی خوبیاں اس کے الفاظ اس کے بعد کی تشبیہات و استعارات کی خوبیاں اور اس کے خیالات کا حسن واضح کیا جائے۔ مدرس کو چاہیے کہ نظم ایک بار پھر سے پڑھ کر سنائے اور طلبہ پر اس کے اثر کا جائزہ لے۔ پھر طلبہ سے نظم پڑھوائے اور اس کی قرأت پر توجہ دے۔

اعادے میں نظم کا خلاصہ طلبہ سے پوچھا جائے۔ سوالات کے ذریعے نظم میں طلبہ کی دلچسپی کا اندازہ لگایا جائے اور ان سے کہا جائے کہ جو اشعار انھیں پسند ہیں وہ سنائیں اور اس کی وجہ بتائیں۔ ان اشعار کے مقابلے میں کسی اور شاعر کا شعر یاد ہو تو سنائیں۔ اساتذہ خود بھی دوسرے شعرا کے ہم مفہوم اشعار سنائیں۔ نظم کے پسندیدہ اشعار حفظ کرا دیے جائیں۔ اشعار یاد کرنے سے باوقار اور پرتاثیر گفتگو۔ دلکش اور پرلطف مضمون نگاری۔ صورت واقعہ کی عکاسی، منظر نگاری اور خود اظہاریت کے طریقے اور سلیقے میں نکھار پیدا ہوگا۔ ساتھ ہی خوشی یا غم کے لمحوں میں جذباتی سہارا ملے گا۔ اس طرح ادبی ذوق وشوق میں اضافہ ہوگا۔

تفہیم اشعار اور نظم کی تحسین کے سلسلے میں بحث ومباحثہ زیادہ ہونا چاہیے تاکہ کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے۔ تدریس نظم کے لیے جو خاکہ سلیم فارانی نے پیش کیا ہے وہ سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اساتذہ چاہیں تو اس میں ضرورت کے مطابق کمی بیشی کر سکتے ہیں، خاکہ کچھ اس طرح ہے۔

تدریس نظم کا خاکہ

(1) تمہید (الف) دلکش آغاز
(ب) طلبہ کی سابقہ معلومات کا جائزہ
(ج) نظم کے موضوع کی طرف گریز

(2) اعلان مدعا (الف) نظم کا عنوان اور درسی کتاب کا صفحہ
(ب) نظم کی اہمیت
(ج) اس نظم میں قابل غور امور

(3) استحضار (الف) نمونہ نظم خوانی معلم کی طرف سے
(ب) طلبہ کی نظم خوانی
(ج) اصلاح تلفظ وغیرہ

(4) تفہیم اشعار (1) نئے الفاظ کے معانی
(2) مرکبات ومحاورات اور تلمیحات کی توضیح
(3) صرفی ونحوی نکات
(4) اشعار کی تشریح
(5) نظم کے مفہوم کی تصریح وتلخیص

(5) استحسان نظم (1) اسلوب بیان (2) موزونیت الفاظ
(3) خوبی تشبیہات واستعارات (4) حسن خیالات

(6) نظم خوانی (1) مدرس کی نظم خوانی
(2) طلبہ کی نظم خوانی موثر پیرائے میں

(7) اعادہ (1) خلاصہ نظم (2) امتحانی سوالات
(3) انفرادی نظم خوانی (4) پسندیدہ اشعار حفظ کرانا۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں ادبیات شناسی، پروفیسر محمد حسن، اردو زبان اور اس کی تدریس، سلیم فارانی، جدید رجحانات تعلیم، ٹیکسٹ بک، ڈی ایڈ سال دوم سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔

□□□

پتہ:
Zubaida Degree College,
Jai Nagar-Shikaripur,
Shimoga-577427

ابنِ نشاطی

کلاسیکی ادب

پھول بن

مشرق میں کہیں ایک شہر تھا، جو کنچن پٹن کہلاتا تھا۔ یہ شہر ندی کے کنارے اس طرح آباد تھا کہ ندی اس کے حصار کی خندق معلوم ہوتی تھی۔ پورا شہر، شہر کی ہر چیز کنچن یعنی سونے کی تھی۔ حصار، بُرج محلات حتیٰ کہ زمین اور درخت، کنکر اور گچ سب سونے کی تھیں جدھر نظر اٹھا کر دیکھیے سونا ہی سونا نظر آتا، اسی لیے اس کا نام کنچن پٹن پڑ گیا تھا۔

اس شہر کے استحکام اور خوبی کا یہ حال تھا کہ اس کے حصار کی بلندی ابر بلکہ ہوا کو بھی گزرنے نہیں دیتی تھی۔ پانی بھی اس کی وسعت کو پہنچتا پہنچتا دو چار منزل دم لے لیتا تھا۔ ایسا نادر شہر روئے زمین پر آنکھوں کے مسافر نے کبھی دیکھا اور نہ کسی کے کان کے جاسوس نے سنا تھا۔

اس کی ہَوا کی یہ تاثیر تھی کہ سدا نشو ونما کا ہنگام رہتا۔ اگر کوئی سوکھی لکڑی لاکر گاڑتا تو وہ سرسبز ہو جاتی اور اس میں شاخیں نکلنے لگتیں۔ اس زمین پر کانٹے بھی بکھیرے جاتے تو وہ بھول کے بھانٹے ہو کر چھوٹتے تھے۔ اس کے محلات میں اگر کوئی چتر کار، تصویر اُتارتا تو وہ تصویر فوراً حرکت کرنے لگتی۔ جو چشمے وہاں سے نکلتے، مٹھاس میں، شہد سے زیادہ تھے، اگر اس پانی کا ایک قطرہ آزمانے کو کوئی دریا میں ڈال دیتا تو تعجب نہیں کہ تمام سمندر میٹھا ہو جاتا۔

اس شہر کے تمام لوگ خاطر جمع اور خوش حال تھے اور سب کے دل کے آہو جفا کے تیروں سے ہر وقت فارغ البال۔ عشرت گویا وہاں پیدا ہوتی تھی۔ اس میں سے جتنی بھی لیجیے کمی نہ ہوتی تھی غرض وہاں سب کچھ تھا اور اگر کچھ نہ تھا تو وہ غم ہے۔ اس شہر پر عجیب آسمانی فیض نازل تھا کہ اس میں پہنچ کر بوڑھے بھی تازہ جوانی پاتے تھے۔ اس پر ہمیشہ خوشی کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ اسی حالت میں وہ شہر بستا تھا۔

اس شہر کا ایک بادشاہ تھا نہایت نامور اور خوش بخت، اسے دنیا کے بادشاہوں میں سروری حاصل تھی۔ بڑے بڑے تاجدار اس کی اطاعت اور ضبط میں تھے۔ روئے زمین پر اس کا ثانی نہ تھا اور بحر و بر اس کے حکم میں تھے مہربانی کے آسمان کا یہ سورج، جہاں پرور کے نام سے دنیا میں مشہور تھا۔ جو کوئی فلک کا ستایا اس کے پاس آتا، جی کی طرح پرورش پاتا اور جو کوئی ہاتھوں کی سیپی کو اس کے سامنے پھیلاتا مقصد کے موتی سے پُر جاتا۔ کسی کو کسی پر دست درازی کی مجال نہ تھی۔ اگر ہوا خاک کو پریشان کرتی تو زمین کو ہوا سے تاوان دلایا جاتا اور اگر کہیں دھرتی پانی کو چُرا لیتی تو، اس کو کھود کر پانی نکالا جاتا۔ شہر گویا ایک باغ تھا اور بادشاہ ایک باغبان۔ اسی کی بدولت سارا جہان تازہ تھا۔

نوا نیر کا خبر دینے والا، چاند سورج کی بات اس طرح کہتا ہے کہ جب سورج بلندی سے پستی کی طرف آیا اور مغرب کے معبد میں جا کر ٹھیرا ساتھ ہی رات کی نشانیاں نمودار ہوئیں اور سارا عالم نیند کے سجدے میں گر پڑا۔ درندوں نے اپنی اپنی گوی کے گوشوں کی راہ لی اور چرندے کونوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ پنچھی بھی آشیانوں میں معتکف ہو گئے، راحت کی فراغت نصیب ہوئی تو بادشاہ نے بچھونے پر استراحت کیا۔ اور جب نیند لگ گئی تو خواب میں ایک درویش کو دیکھا جس کے جسم پر اُجلا سا پیرہن تھا اور ایک باریک سیلے سے کمر بندھی ہوئی تھی۔ سر پر شملہ کے عوض دستار اور ہاتھ میں ایک رنگین طرحدار عصا تھا۔ وہ ہاتھ میں مصلیٰ لیے ہوئے تھا اور اس کا دل ریاضت کی بدولت مصفا۔ اگرچہ اس کا پورا جسم لہو سے خالی تھا، لیکن پیشانی پر سجدے کی لالی موجود تھی، وہ اس حالت سے بادشاہ کے دربار میں کھڑا نظر آیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اجازت کا منتظر ہے۔

جب صبح ہوئی اور پرندوں نے تسبیح و تہلیل شروع کی، اور سورج خطابت کا ساز و سامان لیے آسمان کے منبر پر خراماں ہوا۔ پادشاہ یکبارگی نیند سے بیدار ہوا اور رات کے خواب کو دھیان میں لایا اس کے دل میں خواب کے متعلق طرح طرح کے اندیشے گزرنے لگے۔ فوراً خادم کو بلایا اور حکم دیا کہ دربار میں دیکھ آ کہ کوئی اس طرح کا درویش تو نہیں کھڑا ہے۔ اگر وہ دربار میں نہ ملے تو اس کو جہاں ملے ڈھونڈ کر لے آ۔'' خادم دربار میں گیا، بازار ڈھونڈا، لیکن ایسا درویش نہ ملا۔ وہ گلی، گلی اس ولی کو ڈھونڈتا پھرتا تھا، آخر ایک خانقاہ میں پہنچا، جس کے در و دیوار پر نُور برستا تھا۔ وہاں اربابِ اطاعت اور اہلِ عبادت جمع تھے اور آپس میں طریقت، معرفت، حقیقت کی گفتگو کر رہے تھے خادم نے جب غور سے دیکھا تو وہ درویش ان ہی میں بیٹھا نظر آیا۔ دوڑ کر سجدہ کیا اور بادشاہ کا حکم سنایا۔ درویش روشن ضمیر پہلے ہی سے یہ بات جانتا تھا، اس لیے یہ کہہ کر اُٹھا اور ساتھیوں سے اجازت لی کہ ''کسی کا دل توڑنا خوب نہیں۔'' جب وہ دربار میں آیا تو بادشاہ کو بڑی خوشی ہوئی۔ درویش بڑا صاحبِ کمال تھا۔ اس کی زبان بات میں مشاق اور قلم کی طرح ہر وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ روز ایک تازہ حکایت بادشاہ کو سناتا، اور ہر شب ایک نیا سوز اُسے دیتا۔ جب درویش قصہ کہتا رہتا تو بادشاہ بے مے، مست نظر آتا۔

ایک نرمل رات، جب بدر، سورج کی طرح روشن تھا، اور دن رات میں

کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا تھا، نجومی پریشان تھے کہ چوبیس ساعت کا دن کیسے آ گیا۔ اصطرلاب لے لے کر دیکھتے تھے لیکن یہ راز اُن پر حل نہ ہوسکتا تھا، ایسی رات میں بادشاہ نے خوش ہوکر درویش سے کہا۔ ''تمھاری باتوں میں عجب کچھ سوز ہے کہ میں بے پئے مست ہوجاتا ہوں۔ اب کچھ گفتگو۔'' درویش نے سوچا کہ اس سے معرفت کی حقیقت کھول کر کس طرح کہوں اس کا سمجھنا ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہے، بہتر ہے کہ ایک مجازی حکایت اس کو سناؤں۔ یہ ٹھیرا کر اس نے لب کھولے اور یوں شکر ریز ہوا۔

''ملک خراسان جو سب سے بڑا ملک ہے، میرا باپ وہاں کا پردھان تھا۔ وہ نہایت روشن ضمیر اور صاف باطن شخص تھا، اس کی عقل و فراست کا یہ حال تھا کہ افلاطون، ارسطو اور بوعلی سینا اس کے شاگرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ چھ مہینے بعد جو بات ہونے والی ہوتی، وہ بتلا دیتا۔ اسی سے میں نے ایک حکایت سنی ہے کہ کشمیر میں ایک نہایت عقلمند اور عادل بادشاہ تھا۔ اس کی حکومت ہر چیز پر تھی۔ اگر گل اس کی اجازت کے بغیر کھلکھلاتے، تو ہوا کے ہاتھ سے ان کے ٹکڑے اڑا دیتا۔ اور جو نرگس بغیر حکم کے آنکھ کھولتی تو ہوا کے ہاتھوں خوب جھکولے کھاتی۔ جب بادشاہ حکم دیتا سرو چلتے بلکہ شاید ایک اور پاؤں ہوتا چلنے لگتے۔ ہوا کو اس کی قدرت نہیں کہ بغیر اس کی اجازت کے چمن سے نکہت کو لے کر پراگندہ کرے۔ سنبل اس کے اشارے کے بغیر لب کھول سکتا تھا اور نہ طوطی اور بلبل بول سکتی تھی۔

ایک روز جب موسم بہار پر تھا اور ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے، بلبلیں نغمہ سنجیاں کر رہی تھیں، کوئلیں کوک رہی تھیں بادشاہ نے مجلس جمائی، جب وہ مجلس کو زینت دینے بیٹھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فردوس میں رضواں بیٹھا ہوا ہے، ایسے میں باغباں ایک پھول لے کر حاضر ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا بادِ صبا خوشبو لے کر آئی۔ اس پھول کی بو مشک و عنبر کی طرح تھی جس پر ساری محفل وارفتہ ہوگئی۔ باغبان نے وہ پھول بادشاہ کے نذر کیا اور بادشاہ گل کی طرح شگفتہ ہوکر تعجب سے پوچھنے لگا،

''اے بن کو سدا پانی دینے والے! ایسا پھول چمن میں آج تک نہیں دیکھا تھا، اگر اس کا پودا لاکر میرے چمن میں لگائے گا تو تیرا دامن کلی کی طرح زر سے پُر کردوں گا۔'' مالی نے یہ حکم سن کر اپنا سر زمین پر رکھا اور پانی کی طرح بغیر مڑ کر دیکھے چلا، اس پھول کو وہ چمن چمن ڈھونڈتا پھرا۔ کئی روز بعد وہ پودا اس کے ہاتھ لگا اور اُسے لاکر بادشاہ کے چمن میں لگایا۔ ہر روز وہ ایک پھول بادشاہ کی نذر کو لاتا اور بادشاہ اُس سے بے حد محظوظ ہوتا۔

ایک روز جب بادشاہ نے پھول دیکھا تو اس میں سوکھنے کے آثار نظر آئے۔ رنجیدہ ہوکر مالی سے سبب دریافت کیا۔ مالی نے جواب دیا۔ ''چمن میں ایک کالا بلبل ہے جو گل کا عاشق ہے۔ کبھی تو وہ پھول پر آکر پروں کو پھیلا دیتا ہے اور کبھی کانٹوں پر سینہ مارتا ہے۔ کبھی اپنے چنگل سے پنکھڑیاں کھولتا اور کبھی منقار سے کلیاں تتر بتر کرتا ہے۔ کسی وقت خوشی سے جھوم جھوم کر چہچہاتا ہے اور کسی وقت زار نالی کرتا ہے، اس لیے پھول کملا گیا ہے۔'' یہ سن کر بادشاہ کو بڑا رنج ہوا۔ اُس نے حکم دیا کہ ''بلبل کے لیے ایک پھاندا باندھو اور اس کے حلقے ایسے تنگ کرو کہ پانی بھی، اس میں مچھلی کی طرح سر پر جائے اور اگر ہوا بھی اس میں سے گزرنا چاہے تو پرندے کی طرح گرفتار ہوجائے۔'' شکاری نے اسی طرح کا پھندا اس جھاڑ کے نیچے باندھ دیا اور بلبل کو دھوکا دینے کے لیے اس میں کچھ دانے بھی ڈال دیے۔

آسمان دام ہے اور تارے دانے، کیونکہ اس کے کاروبار دام جیسے ہیں، اس دام سے کسی کو غافل نہ رہنا چاہیے۔ اس کا کام بے وفائی ہے اور اس سے کدورت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ دیکھو کہ ستاروں کو کبھی رکھتا ہے اور کبھی نہیں رکھتا۔ بادل کو گھڑی بھر کے لیے کہیں امن نہیں دیتا۔ دو دوست جو یک تن ہوکر رہتے ہیں انھیں جوزا کی طرح الگ کردیتا ہے۔ جو کوئی خوشی سے پاؤں پسار کر بیٹھتا ہے، اسے عقرب بن کر ڈنک مارتا ہے۔ بیچارے بلبل نے جب اس جگہ دانے پڑے دیکھے تو بڑا خوش ہوا اور سمجھا کہ آج نصیبے کی یاوری ہے، میرا بخت مجھ سے سازگار ہے شاید میرے بُرج میں چاند ہے اور میرے ستارے کی مجھ پر نظر عنایت ہے کہ محبوب اور چارا دونوں ایک جگہ مل رہے ہیں۔ عرصہ سے بغیر کھائے پئے پڑا تھا۔ بارے آج راحت کے ساتھ چارہ کھا کر، گل کا نظارہ کروں گا۔'' اسے کیا معلوم تھا کہ دشمنوں نے شکر میں زہر ملا کر رکھا ہے بلبل مارے خوشی کے گل کی طرح شگفتہ ہوکر دیوانہ وار دانہ پر گرا، جوں ہی اس کا پاؤں پڑا، پھندا گلے میں تھا۔ وہ غریب دانہ کھانے گیا تھا، الٹا پھندا گلے میں پڑ گیا اور پھر پھڑانے لگا۔

عزیزو! طمع بُری چیز ہے اسے خوب نہ جانو، اس سے ذلت نصیب ہوتی ہے۔ وہی تمام بلاؤں سے چھوٹے ہوئے ہیں، جو طمع داری سے دُور ہیں، وہ بلبل دانے کی طمع سے بند میں گرفتار ہوا۔ پھندے میں پڑ کر بلبل اپنے گل کو مخاطب کرکے کہنے لگا کہ ''میرے جان کے ساتھی، اے میری روح کی راحت، تیرے رُخ سے میرے نین روشن اور تیرے لب سے میرے بین شیریں تھے۔ تیری نزدیکی سے میرے برگ کی تازگی تھی۔ تیری جدائی میں میری مرگ ہے۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے اے یار تیرے بغیر میں کیونکر رہوں۔ میں آج تک بغیر کھائے پئے تیرے قدموں کے پاس چھانوں ہوکر پڑا تھا۔ جہاں بھی جاتا پھر اسی جگہ لوٹ آتا اور تجھ کو بغیر پلک مارے گھورتا رہتا۔ مجھے اس کا غم نہیں کہ میں گرفتار ہوگیا، غم اس کا ہے کہ تجھ سے دور پڑ گیا۔''

پاپی شکاری نے جب بلبل کو دام میں پھنس کر زاری کرتے دیکھا تو غصے سے ہونٹ چباتا ہُوا استم کی آستینوں کو چڑھا کر دوڑتا ہوا آیا اور اس کو پکڑ کر پنجرے میں ڈال دیا۔ پنجرا اتنا تنگ تھا کہ دم بھی باہر نکل نہ سکتا تھا، اس کی تنگی نجیلیوں کی گور بلکہ چشم مور سے زیادہ تھی۔ شکاری اس پنجرے کو لے کر بادشاہ کے پاس آیا اور تسلیم بجالا کر، پنجرا اس کو پیش کیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور بلبل کو ایک جڑاؤ پنجرے میں ڈال کر دربار میں رکھا۔

جب بلبل نے دیکھا کہ اب وہ دن رہے نہیں، اور محبوب کے درشن کے دروازے اس پر بند ہو گئے ہیں تو سر کو پروں میں چھپا کر اور پکوئے ڈھال کر رونے لگا کہ ''مجھ پر جو بیت رہی ہے، اس کا حال، اس گل سے کون بیان کرے گا؟ اس حور کے بغیر، میرے لیے دنیا دوزخ ہے، اور اس مدرو کی جدائی میں، دن رات کی طرح تاریک۔ جب سے اس سے گلبدن سے دور ہوا ہوں، میرے بدن کا رُواں، رواں کانٹا ہو کر سل رہا ہے۔ یوَن کے بغیر میرا کوئی محرم نہیں جو اس کے پاس جا کر میرا غم کہہ سُنائے۔'' اے خوش باش ہوا، بارے تو ہی میرا دکھ پھول سے بیان کر، کاش میرا جسم ہوا کا ہوتا! میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ لیکن افسوس اب وہ پاؤں کہاں جو اُس تک جا سکوں، اور وہ آنکھ کہاں جو اس کا درشن دیکھ سکوں۔''

بلبل کو اس طرح زاری کرتا دیکھ کر بادشاہ نے ایک روز اُس سے پوچھا۔ ''تو کیوں اس قدر پریشان ہے؟ کس جادو چشم کی خاطر اس طرح بے خواب اور کس کی زلف کے لیے اتنا بے تاب ہے۔ مجھے کہہ کہ کس لیلیٰ کا تو مجنوں ہے اور کس کی نگہ کا تجھے تیشہ لگا ہے کہ تو نے کوہ کن کا پیشہ اختیار کیا۔ سچ بتا کہ تو کس کنول کا بھنورا اور کس پھول کا بلبل ہے؟''

بلبل بادشاہ کی گفتگو سن کر، آنکھوں کے دریا سے موتی رونے لگا، اور یوں جواب دیا کہ ''تو میرا دکھ نہ سنے اور میری آگ کے پھول نہ چنے تو بہتر ہے۔ جس کے دل میں میرا سا دکھ بھرا ہوگا، اُس کے لیے زمین سخت اور آسمان دُور ہے۔ جو برہ پھندے میں پھنسا ہو اور جس پر بیتی ہو، وہی میرا دکھ سمجھ سکتا ہے۔ کیا بتاؤں میرا دل غم سے کیوں پچھاڑیں کھا رہا ہے۔ یہ دُکھ نہ کہا جا سکتا ہے اور نہ کہنے میں آ سکتا ہے اور اس کے کہنے میں فائدہ ہے اور نہ چپ رہنے میں۔ اگر یہ بات زبان پر لاؤں بھی تو کیا فائدہ؟''

بادشاہ بلبل کے غم سے اشکبار ہو کر کہنے لگا۔ ''شکر کھائے بغیر منھ میٹھا نہیں ہو سکتا اور بغیر مشورے کے کام درُست نہیں پڑتا۔ مجھے اپنے دل کی بات سُنا، ممکن ہے کہ میرے ہاتھ سے تیرا مقصد پورا ہو۔''

اس قدر دلاسا پا کر بُلبل اپنا احوال بادشاہ کو اس طرح سنانے لگا۔

''میرا باپ ختن کا سوداگر تھا، مال و دولت کی اس کے پاس کچھ کمی نہ تھی۔ گھر میں مہروں کے انبار لگے ہوئے تھے، اور روپے اور دینار ڈھیروں سے تھے۔ تمام بندرگاہوں میں اس کی شہرت تھی، وہ سب سوداگروں میں بڑا تھا۔ طرح، طرح سے بیش قیمت کپڑوں کے بستوں سے اس کی دُکانیں بھری پڑی تھیں۔ دریا میں اس کی کشتیاں اتنی چلتی اور کھڑی تھیں کہ اُن کی گرمی سے دریا سوکھ کر کیچڑ ہو گئے تھے۔ وہ اپنی تجارت کے سلسلے میں عربستان، حلب، روم، شام، بنگالا، آسام، واسط، اسفرائین، صفاہان، مداین، تبریز، شروان، ہمدان، کاشان، ارمن، روس، طوس، سراندیپ، شیراز، اردبیل، ختن، یمن، دماوند، بُخارا، سمرقند، کابل، لاہور، مانڈو، ماہور، غرض سارے عالم کا چکر لگاتا رہتا۔ اتفاق سے وہ ایک دفعہ تجارت کے کئی ساماں لے کر، گجرات گیا۔ اس سفر میں، میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس وقت میری ابتدائی جوانی تھی اور ذوقِ عشرت نے مجھے بدمست بنا رکھا تھا۔

ہم جہاں ٹھہرے تھے، وہیں قریب میں ایک زاہد پارسا رہتا تھا، اس کی ایک بیٹی تھی۔ بڑی چتر، بڑی چنچل، میں اس کا سراپا کیا بیان کر سکوں گا۔ اس کے ابرو کا نور، محراب مسجد پر کبھی نہیں دیکھا گیا اس کی پیشانی، چاند سے زیادہ چمکدار تھی۔ اس کی پلکوں کو تیر اس لیے نہیں کہنا چاہیے کہ کبھی کوئی تیر کا اسیر نہیں ہوتا۔ اس کے نین کو نرگس کہنا نازیبا ہے، کیونکہ نرگس میں وہ ناز کہاں؟ اس کی ناک چمپے کی کلی کی طرح نازک تھی۔ اس کے رُخسار کو لالے سے کیسے تشبیہہ دوں کہ لالہ میں داغ ہوتا ہے۔ ہونٹ کو لعل کیونکر کہوں کہ لعل میں وہ نرمی اور نازکی کہاں؟ دانتوں کو انار دانے نہیں کہہ سکتے، ان پر دانے بھی دیوانے تھے۔ اس کی ٹھوڑی جیسا سیب دنیا میں کہاں ہے جس میں عشق کا آسیب ہو؟ اس کی کمر کے سامنے شرزے کا ذکر ہرزہ ہے۔ سرو، اس قد کی حد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر اس کی چال کو کوئی ہنس کی چال سے تشبیہہ دے تو اس کی عقل پر ہنسنا چاہیے، غرض اس موہنی کا سراپا جیسا تھا، اس کی تعریف کرنے کی مجھ میں سکت نہیں۔

میرے دل میں اس کے دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی۔ جب وہ یاد آتی تو میرے سینے میں گدگدی ہوتی ہے۔ اس کی پرت کی ہوا جو لگی تو میرا حال دگرگوں ہونے لگا۔ میں ہر روز اس کی گلی کو جاتا۔ پا پیادہ اور اکیلا۔ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا کبھی اس دیوار سے لگ کر چلتا اور کبھی اس دیوار سے، تا کہ کوئی نہ دیکھ لے اور وہاں پہنچ کر اس چندر بدن کے گھر کی طرف منھ کر کے، آنکھوں کے تارے بکھیرتا اور آہوں کا کھلا باندھتا۔ کتنے دن بعد، اُمید کا سورج طلوع ہوا اور میرے بخت کے آنکھوں کو نور بخشا۔ نصیبہ جو دوست ہوا تو، یکا یک وہ چنچل میری طرف جھانک کر دیکھی میری اور اُس کی نظریں چار ہوئیں اور ہم دونوں کے دل مل کر ایک ہو رہے۔ اب یہ حال ہُوا کہ جس طرح میں اُسے یاد کرتا، وہ بھی مجھے یاد کرنے لگی۔ کبھی میں اُس کے قدموں کے پاس سر سے چلتا جاتا او

رکبھی وہ مجھے گھر پہنچا جاتی۔ اسی طرح سے دن رات گزرتے گئے۔ کبھی لوگوں کے ڈر سے ہم اپنی جگہ پر رہتے اور کبھی کوئی نہ سنے جیسا بات کرتے یا چھپ کر اشارے کرتے۔ کبھی ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھا کرتے اور کبھی، ایک دوسرے کو نظروں میں چُراتے۔

ناگہاں کسی نے زاہد کو اس کی خبر کردی۔ چاڑی خور کا منھ جگ میں کالا۔ زاہد یہ خبر سن کر تلملانے اور اپنے آپ میں غم سے پچھاڑیں کھانے لگا۔ آبرو جاتی دیکھ کر وہ مارے شرم کے ایک حجرے میں بند ہوگیا۔ اور سرو کی طرح ایک قدم پر کھڑا ہوکر، ڈھاک کے پتوں کی طرح ہاتھ پھیلایا اور بددعا کی کہ ہماری صورت تبدیل ہوجائے۔ اتفاق سے اس روز رحمت کے کواڑ کھلے تھے، اُس کی دعا تیر کی طرح آسمانوں کے ساتوں سپر سے گزر گئی اور سیدھی نشانہ پر جا لگی۔ میں ماتمی کوت کے ساتھ بلبل اور وہ گُل کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ اُسی وقت سے دردناکی اور سینہ چاکی میں مبتلا ہوں۔'' بلبل نے دُعا پر کلام ختم کیا اور کہا ''آگے تجھے سب معلوم ہے، اب میرے بخت ہیں اور تیری نظر۔''

یہ احوال سُن کر بادشاہ کو خیال آیا کہ اس کے خزانے میں ایک انگوٹھی ہے جس کو اگر مسوخ پر پھرائیں تو وہ صورت اصلی پر آجاتا ہے۔ اُسی وقت خزانے دار کو بُلا کر، انگوٹھی لانے کا حکم دیا۔ جب انگوٹھی آگئی تو بادشاہ نے پہلے وضو کیا، پھر آیۃ الکرسی کو پڑھ کر، دونوں پر اس کو پھرایا خدا کے فضل سے وہ جیسے پہلے تھے ویسے آدمی بن گئے۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت تھے۔ جو اُن کی صورت دیکھتا کہتا یہ لیلیٰ ہے اور یہ مجنوں، شیریں اور فرہاد ایسے ہی تھے، کیا یوسف اور زلیخا دنیا میں پھر آئے ہیں؟''

بادشاہ بہت خوش ہوا اور بڑی دھوم سے اُن کا بیاہ کردیا۔ سوداگر کے بیٹے کو دربار میں ایک بڑا منصب عطا کیا گیا۔ وہ ہر روز صبح بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا اور قصوں سے اس کا دل بہلایا کرتا۔ ایک روز بادشاہ نے اس سے فرمائش کی کہ آج کوئی عشق کا قصہ بیان کریں کہ محبت اور اُس کے سوز سے تو واقف ہے۔'' یہ حکم سن کر اس نے اس طرح قصہ شروع کیا۔

ملوک پیشین، میں سے ایک کے متعلق میں نے سُنا ہے کہ وہ بڑا عالی ہمت اور صاحب لشکر تھا۔ ایک روز دربار بھرا ہوا تھا اور بادشاہ تخت پر جلوہ افروز کہ حاجبوں نے آکر خبر دی۔ چین سے ایک نقاش آیا ہے اور کئی نقش لکھ کر لایا ہے۔'' چین کا نام سنتے ہی بادشاہ کے چہرے پر غم کے آثار نمودار ہوئے اس نے ایک وزیر کو بڑے لشکر کے ساتھ چین کا ملک فتح کرنے بھیجا تھا۔ اُس وقت سے اُس کی خبر نہیں آئی تھی۔ بادشاہ کے دل میں اندیشے گزرنے لگے کہ کہیں وہ خود ملک لے کر نہ بیٹھ گیا ہو۔ پھر یہ سوچ کر یہ کہانی خوب نہیں، اُس نے ایک ندیم کو طلب کیا اور حکم دیا کہ کوئی حکایت بیان کرتا کہ غم غلط ہو۔ ندیم واقف کار تھا، موقع کے مناسب اس نے یہ حکایت بیان کی۔

''ایک راجہ فہم وذکا میں بڑا مشہور تھا۔ اُسے جوگیوں سے بڑا اعتقاد تھا۔ ملک ملک کے جوگی اس کے پاس آتے تھے ایک روز ایک جوگی اس کے شہر میں آیا۔ بادشاہ نے خود جا کر اس کو لیا۔ محل میں لا کر عزت سے بٹھایا اور احوال پوچھنے لگا کہ تم کہاں سے آئے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟ کرم کیا کہ ہم کو درشن دکھلایا۔'' جوگی نے جواب دیا۔ ''اے بادشاہ! ہم آنے، جانے والے کون، جو کچھ کرتا سوحق کرتا ہے۔ ہماری ناتھ کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔'' بادشاہ نے اس کو بہت عزت سے رکھا۔ اس کے لیے گھی اور دودھ کا راتب مقرر کردیا۔ جوگی نے یہ سوچ کر بادشاہ کے پیار کا کچھ تو ابکار کروں اُسے نقل روح کا منتر سکھا دیا، جس سے وہ کسی اور جسم میں جا سکتا تھا اور جب چاہے واپس اپنے تن من آسکتا تھا۔ بادشاہ کا ایک وزیر بڑا ہوشیار تھا، اور وہ اُسی زمانے میں اتفاق سے ایک بڑا کام انجام دے کر آیا تھا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر اس سے فرمایا کہ'' کیا مانگتا ہے؟ مانگ'' اس نے سجدہ کرکے کہا۔'' تیری ہمت سے سیم وزر کی کمی نہیں۔ اتنی کرم بخشی تو نے کی ہے کہ کسی چیز کی حاجت نہیں۔ لیکن اگر مجھ کمینے پر مہربانی کرکے نقل روح کا منتر مجھے سکھا دے تو، ذرہ نوازی ہے۔'' بادشاہ یہ سنتے ہی گال کو ہاتھ لگا کر سوچنے لگا کہ اس کو یہ ہنر سکھانا، اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ لیکن قول دے چکا ہوں۔ نا، بولوں تو جھوٹا ٹھہرتا ہوں۔ بادشاہ دنیا میں جھوٹ بولنے لگیں تو پھر کون کسی کو پتیائے گا۔ یہ سوچ کر، خدا پر توکل کیا اور اس کو منتر سکھا دیا۔

ایک روز بادشاہ شکار کے لیے گیا۔ جب شکار کھیل کر واپس ہونے لگا تو قضا کے حکم سے وہ لشکر سے جدا ہوگیا۔ اُس کے ساتھ سوائے اُس وزیر کے کوئی اور نہ تھا۔ پھرتے پھرتے دونوں ایک جنگل میں پہنچے۔ یہاں راستے میں ایک ہرن مردہ پڑا ہوا ملا۔ بادشاہ کو خواہش ہوئی کہ اس کے جسم میں جا کر منتر کو آزماؤں۔ تھوڑی دیر ہرنوں کے ساتھ پھروں اور ہرنیوں کی پیت کا مزا لوٹوں۔'' یہ سوچ کر اس نے اپنی روح ہرن کے مردہ جسم میں منتقل کی اور پھرنے کے لیے جنگل کی طرف چلا گیا۔ وزیر نے بادشاہ کا جسد خالی پڑا ہوا دیکھا تو بادشاہ بننے کی ہوس دل میں پیدا ہوئی۔ فوراً اپنی رُوح کو بادشاہ کے جسم میں داخل کیا اور اپنا جسم تلوار سے ٹکڑے، ٹکڑے کرکے پھینک دیا اس طرح دغابازی سے وہ سلطنت لے کر بیٹھ گیا۔

اس بادشاہ کی ایک رانی تھی جس کا نام ستونتی تھا۔ اس کی عصمت اور عفت کا یہ حال تھا کہ چاند، سورج بھی اس کی چھانوں دیکھنے نہ پائے تھے۔ اگر کبھی وہ آئینہ کے سامنے جاتی تو اپنے مردم چشم کو دیکھ کر شرما جاتی اور کبھی بال کھولتے کنگھی لیتی تو پنجہ کا نمونہ سمجھ کر پھینک دیتی۔ نرگس کو دیکھ کر منہ پر آنچل کھینچ

لیتی۔ اس کی پاکدامنی کی عورتیں قسم کھایا کرتی تھیں۔ اس نے بادشاہ کے چال چلن نئے دیکھے تو اس کو شبہ ہوا۔ جب بھی وہ اس سے محبت کا اظہار کرتا ستونتی حیلے سے ٹال دیتی۔

اصلی بادشاہ جب واپس آیا تو جسم کی جگہ خالی دیکھی۔ اُسے بڑا رنج ہوا لیکن کیا کرتا ناچار مکار وزیر کو کوستا پھرتا تھا کہ ایک مرا ہوا طوطا نظر پڑا۔ اس نے فوراً اپنی روح کو اس میں منتقل کیا اور نئی زندگی اختیار کرکے بادشاہ کے شکاری کے گھر پر جا بیٹھا۔ شکاری اسے دیکھتے ہی پنجرا درست کرنے لگا۔ طوطے نے اس سے کہا کہ ''پنجرے کی ضرورت نہیں، میں خود گرفتار ہوتا ہوں، لیکن ایک شرط پر، تو مجھے بادشاہ کے ہاتھ بیچ دے۔'' شکاری اس کی گفتگو سن کر حیران ہوا اور اُسے پنجرے میں ڈال کر فریبی بادشاہ کے پاس لے گیا۔ وہ بھی اس کی میٹھی باتیں سن کر بہت خوش ہوا، اور اسے خرید کر اسی مقام پر رکھا جہاں ستونتی رہتی تھی ایک روز طوطے کو موقع ملا، اُس نے ستونتی سے پوچھا ''اے سروآزاد تیری جوانی کا رنگ کیوں برباد ہوا، کس کے غم میں تُو بے کل ہے۔'' ستونتی نے آہ کھینچ کر کہا۔ ''سب عالم پر یہ بات روشن ہے کہ دیا نہ ہو تو رات کیسے سہاتی ہے اور جس کے منھ میں تنبول نہ ہو۔ وہ منھ کیونکر بھلا لگے گا۔ جدائی میں مرنا آسان ہے، بغیر پیو کے زندہ رہنا مشکل۔ پریشان ہوں مگر محبت میں ثابت قدم ہوں۔ شمع کی طرح جل رہی ہوں لیکن اپنی جگہ سے ٹلی نہیں۔'' طوطے نے اس کی وفاداری دیکھی تو رو کر اپنا سارا ماجرا کہہ سنایا، اور کہا کہ اب کے وہ تیرے ساتھ محبت کا اظہار کرے تو، تو اس سے کہہ تو وہ راجا نہیں ہے، تجھ پر مجھے شبہ ہوتا ہے۔ وہ نقلِ روح کا فن جانتا تھا۔ وہ فریبی تجھ پر قابو پانے کے لیے اس پر تیار ہو جائے تو، تو مردہ قمری کو اس کے سامنے رکھ دے۔ آگے میں اپنا کام سمجھتا ہوں۔

چنانچہ یہی ہوا۔ جب اس نے ستونتی سے یہ سُنا تو اُچھل پڑا، اور کہا ''تو کیا آزماتی ہے، دیکھ!'' ستونتی نے فوراً مری ہوئی قمری اس کے سامنے رکھ دی۔ ''جوں ہی فریبی نے قمری کے جسم میں اپنی جان ڈالی، بادشاہ، اپنے اصلی جسم میں آگیا اور قمری کی ٹانگیں چیر کر اسے پھینک دیا اور سلیمان کی طرح پھر تخت پر بیٹھ گیا۔ دنیا کو خوشی نصیب ہوئی اور سب آداب، احترام بجالائے۔

(ماخوذ از: پھول بن، مصنف: ابن نشاطی،
شائع کردہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، قیمت -/61 روپے)

❑❑❑

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس / مترجم: ایس. ایم. احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیٔ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہدِ آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/25 روپے

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاثمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبرنامہ'' کے ساتھ ساتھ ملا عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبرنامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

کلاسیکی ادب

شاہ نجم الدین مبارک آبرو

غزلیات

آیا ہے صبح نیند سوں اٹھ رسمسا ہوا
جاما گلے میں رات کے پھولوں بسا ہوا
کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد
سونا وہی جو ہووے کسوٹی کسا ہوا
انداز سیں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
جو خال حد سے زیادہ بڑھا سو مسا ہوا
قامت کا سب جگت منیں بالا ہوا ہے نام
قد اس قدر بلند تمھارا رسا ہوا
زاہد کے قد خم کوں مصور نے جب لکھا
تب کلک ہاتھ بیچ جو تھا سو عصا ہوا
دل یوں ڈرے ہے زلف کا مارا وہ پھونک سیں
رسی سیں اژدہے کا ڈرے جوں ڈسا ہوا
اے آبرو اول سیں سمجھ بیچ عشق کا
پھر زلف سیں نکل نہ سکے دل پھنسا ہوا

●

اس زلف جاں گزا کو صنم کی بلا کہو
افعی کہو سیاہ کہو اژدہا کہو
قاتل نگہ کو پوچھتے کیا ہو کہ کیا کہو
خنجر کہو کٹار کہو نیمچا کہو
ٹک واسطے خدا کے مرا عجز جا کہو
بے کس کہو غریب کہو خاک پا کہو
عاشق کا درد حال چھپانا نہیں درست
پرگھٹ کہو پکار کہوں برملا کہو
اس تیغ زن نیں دل کوں دیا ہے مرے خطاب
بسمل کہو شہید کہو جاں فدا کہو
شاہ نجف کے نام کوں لو آبرو سیں سیکھ
ہادی کہو امام رہ نما کہو

●

شاہ نجم الدین مبارک آبرو (1684-1733) دلّی میں باقاعدہ اردو شاعری کے بنیاد گزاروں میں ہیں۔ ان کا کلام اردو زبان وشعر کے ارتقا کی اہم کڑی ہے۔ ثقافتی سطح پر یہ ایک طرف مشترکہ ہندو مسلم تہذیب کا آئینہ دار ہے جو صدیوں پہلے سے ہندوستان میں ترکیب پا رہی تھی اور دوسری طرف یہ اس عارضی سکھ چین اور بے فکری کی فضا میں سمویا ہوا ہے جو دلّی میں 17 ویں صدی کے اواخر اور بالخصوص 18 ویں صدی کے اوائل میں قائم تھی۔ لسانیاتی سطح پر یہ اس دور میں فارسی کے مقابلے میں اردو شاعری کے فروغ کا اہم ثبوت ہے اور شمالی ہند کی بولیوں کی دھوپ چھاؤں میں کھڑی بولی کے غلبے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس طرح یہ اردو شاعری ہی کی تاریخ کے بامعنی مطالعے میں ناگزیر نہیں ہے بلکہ شمالی ہند کی سماجیاتی تاریخ کے مطالعے میں بھی نہایت مفید ہے۔ (محمد ذاکر)

(بہ شکریہ سہ ماہی اثبات، شمارہ 4-5)

صفی اختر

عالمی ماحولیاتی کانفرنس

کائنات کا نور و نکہت حیاتیاتی تنوع اور فطرت کی نیرنگیوں سے قائم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں فطرت (Nature) کے ساتھ مفاہمتی زندگی گزارنے اور ہم آہنگی قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ماحولیات کا توازن ہماری اجتماعی وراثت ہے، جسے اپنی نسل کے لیے ہمیں وراثت میں چھوڑنا ہے۔ آج عالمی سطح پر موسمی تبدیلی مستقبل کے لیے ایک حقیقی خطرہ بن گئی ہے۔

ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن (Copenhagen) میں 7 دسمبر تا 18 دسمبر 2009 اقوام متحدہ کی جانب سے 12 روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی کیے جانے اور اقتصادی شرح نمو میں بے لگام آزادی پر کنٹرول کرنا تھا۔ خالق کائنات نے چاند، سورج اور دیگر تمام سیارے اور کواکب انسانوں کی ضرورت کے لیے پیدا کیے ہیں اور اس نظام کائنات کا ہر ذرہ ان ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے۔ اس میں اہل عقل و دانش کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جن پر ہمیں غور و فکر کرنا چاہیے۔

سورج، وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ گرم ہوتا جا رہا ہے۔ سورج کوئی ٹھوس اور کثیف چیز نہیں، بلکہ یہ ہائیڈروجن اور ہیلیم (Helium) جیسی رقیق گیسوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہائیڈروجن 75% اور ہیلیم 24% ہے جبکہ آکسیجن ایک فیصد ہے۔ آج سورج اپنا ہائیڈروجن جلا جلا کر ہیلیم میں تبدیل کر رہا ہے۔ فضائی کرۂ قائمہ کے بالائی حصے میں 33 کلومیٹر کے فاصلے پر قدرتی طور پر اوزون (Ozone) کی ایک پرت ہے، جو زمین کو تحفظ فراہم کرتی ہے، یہ پرت ایک غلاف کی طرح ہے، جو زمین کے اردگرد لپیٹ دیا گیا ہے، اوزون کی یہ پرت، سورج سے آنے والی ہلاکت خیز اور خطرناک حد تک گرم شعاعوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، گویا یہ پرت سورج کی روشنی کے لیے ایک فلٹر (Filter) ہے، اس فلٹر میں سورج کی شعاعیں چھن کر دنیا پر منعکس ہوتی ہیں۔ اگر اوزون کی یہ دبیز پرت سورج کی تباہ کن شعاعوں کو جذب نہ کرتی تو کرۂ ارض پر نباتات اور حیوانات کا وجود اور ان کی بقا خطرے میں پڑ جاتی۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ کارخانوں، فیکٹریوں اور فضا میں گردش کرتے جہازوں سے جو دھواں نکل رہا ہے، اور جو گیسیں خارج ہو رہی ہیں، وہ گولوں کی شکل میں تبدیل ہو کر اوزون کی اس پرت سے ٹکراتی ہیں اور وہ اس میں شگاف پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ اس عمل سے اوزون کی ان پرتوں کے متاثر ہونے کی بنا پر جو حرارت پیدا ہو رہی ہے، اس سے سمندر میں موجود بڑے بڑے برفیلے گلیشیر پگھلنے لگے ہیں اور ان کا پانی سمندر کے پانی میں مل کر اس کے پانی کی سطح میں اضافے کا سبب بن رہا ہے، یعنی درجۂ حرارت بڑھنے کے سبب برفیلے تودے مسلسل گھل رہے ہیں جس سے سمندر کی آبی سطح بڑھ رہی ہے۔ اندیشہ ہے کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو آئندہ چند برسوں میں دنیا کے کئی بڑے ساحلی شہر غرقاب ہو جائیں گے۔ جب انسان خالق ارض سما کے پیدا کردہ نظام کائنات سے چھیڑ چھاڑ کرے گا تو اس طرح کی تباہ کن صورت حال پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ماحولیاتی تحفظ کا مسئلہ بے حد گمبھیر صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے پالیسیاں تو بنائی گئیں لیکن فطری عناصر پر توجہ نہیں دی گئی۔ گذشتہ تین دہائیوں میں کئی بین الاقوامی معاہدے، سمجھوتے، قوانین اور قواعد و ضوابط بنائے جا چکے ہیں، لیکن ان کے نفاذ میں بڑی کمیاں نظر آتی ہیں۔ عالمی سطح پر ان قوانین کے تئیں سنجیدگی تو دیکھی جا رہی ہے، لیکن ترقی یافتہ ملکوں کا رویہ قابل اطمینان نہیں۔

کوپن ہیگن کی کانفرنس میں شامل ہونے والے وہ 6 ممالک جو دنیا کے 60 فیصد گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج کرتے ہیں، وہ کام نہیں کر سکتے جو ہندوستان کر رہا ہے۔ ہندوستان صرف 4 فیصد گرین ہاؤس گیس کا اخراج کرتا ہے، 2005 میں گیس کی جو سطح تھی ہندوستان نے اس میں 25-20 فیصد تک کمی لانے کا عندیہ دیا ہے۔ چین جو عالمی سطح پر گرین ہاؤس گیسوں کا 21 فیصد اخراج کرتا ہے، اس نے 2005 میں گیس کے اخراج کی جو سطح تھی اس میں 2020 تک 45-40 فیصد کمی لانے کا عندیہ دیا ہے۔ حالانکہ ہندوستان اور چین میں گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج اور توانائی کا استعمال ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں بے حد کم ہے۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں بڑھتے اختلافات کے درمیان ماحولیات میں تبدیلی پر کوپن ہیگن میں 15 ویں چوٹی کانفرنس کا انعقاد ہوا، جہاں خود ترقی پذیر ممالک کے درمیان بھی کئی اہم ایشوز پر اختلافات ابھر آئے۔ گرین ہاؤس گیسوں کے ارتکاز کا معاملہ بے حد توجہ طلب ہے۔ ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کی سطح روز افزوں ہے۔ ان ممالک میں امریکہ سب سے اوپر ہے۔ جارج ڈبلیو بش کی موسمی تبدیلیوں سے متعلق پالیسیوں کی پرزور مخالفت کرنے والی سابق سینیٹر، اور موجودہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہلیری کلنٹن، ماحولیاتی ابتری

کے لیے امریکہ کو ہی زیادہ ذمے دار مانتی رہی تھیں، آج ان کے تیور یکسر مختلف ہیں۔ تاہم اس وقت امریکہ نے گیسوں کے اخراج میں کمی کا وعدہ کیا ہے۔

کوپن ہیگن میں 130 ملکوں کے عالمی سربراہان نے کم وبیش 15 ہزار نمائندہ شخصیات کے ساتھ اقوام متحدہ کی اس کانفرنس میں شرکت کی جسے یقیناً ایک حوصلہ افزا پیش رفت کہا جاسکتا ہے۔ تاہم ترقی پذیر و ترقی یافتہ ممالک کے درمیان اپنی ذمے داریاں ادا کرنے کے تعلق سے جو تعطل پیدا ہوا، اس کے سبب عالمی برادری کی اس اہم چوٹی کانفرنس کو ''نشستند و گفتند و برخاستند'' سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ 1977 میں ہونے والے کیوٹو معاہدے (Kyoto Protocol) کی میعاد 2012 تک ہے، اب دیکھنا ہے کہ امریکہ اس وعدے پر بھی قائم رہتا ہے یا نہیں؟ ترقی یافتہ صنعتی ممالک کی جانب سے گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی لانے کے معاملے میں تاخیری حربے استعمال کرنے پر ایک مرتبہ پھر اس چوٹی کانفرنس کے موقع پر عوامی احتجاج بھی دیکھنے میں آیا اقوام متحدہ کی اس 15 ویں چوٹی کانفرنس میں جس میں دنیا بھر کے سربراہان مملکت، صدور، وزرائے اعظم اور وزرائے خارجہ تبادلۂ خیال کے لیے جمع ہوئے تھے، کوپن ہیگن کے بیلا سنٹر (Bela Centre) کے باہر 30 ہزار افراد یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اس کانفرنس میں موسمی تبدیلیوں کے حوالے سے ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔ مظاہرین کے غصے کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے زبردست نعرہ بازیاں کیں اور سرکاری املاک کو نقصان بھی پہنچایا، وزارت خارجہ کی عمارت کے شیشے توڑ ڈالے اور پولیس کو حالات پر قابو پانے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ بعض خبروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مظاہرین کی تعداد ایک لاکھ تھی، اور یہ لوگ چھ کلومیٹر تک مارچ کر کے اس جگہ پہنچے جہاں وزرائے خارجہ اور موسمی امور کے ماہرین ملاقات کر رہے تھے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے درمیان طریقۂ کار اور اخراجات کے حوالے سے کافی اختلافات ہیں اور ماحولیاتی تبدیلیوں پر تجاویز کا متن (Long-term action draft texts) اب تک جامع شکل میں سامنے نہ آسکا ہے۔

پانچ افریقی ممالک نے ترقی یافتہ ممالک پر الزام لگایا کہ وہ گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی کے معاملے میں اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا الزام تھا کہ ترقی یافتہ ممالک کیوٹو پروٹوکول کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو تقریباً 40 صنعتی ممالک کو 2012 تک ان گیسوں کے اخراج میں کم از کم 5.2 فیصد تک کمی لانے کا پابند بناتا ہے۔ یو.کے انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ کے ایک ذمے دار نے کہا کہ ''میں پوری دنیا کے لوگوں سے ملاقاتیں کر چکا ہوں جو موسمی تبدیلیوں کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ ایسے خاندانوں سے جو بنگلہ دیش میں سیلاب کی قہر سامانیوں سے نبرد آزما ہوئے ہیں اور انھیں مجبوراً اپنے گھر تک چھوڑ دینے پڑے۔ پھر میں ایتھوپیا کے ایک خطے کی ان عورتوں سے بھی ملا جو ہر سال پانی کے قحط اور خشکی سے مجبور ہوکر دوسری جگہوں پر جانے کے لیے مجبور ہوجائیں، نیز میں نے کولکاتہ کے ان نشیبی علاقوں کو بھی دیکھا جہاں غریبوں کی جھگی جھونپڑیاں ہیں۔'' ان کا کہنا تھا کہ موسمی تبدیلی کی افتاد چھوٹے طبقات پر زیادہ پڑتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 2020 تک افریقہ بشمول کچھ ان ممالک کے جن کی زراعت محض بارش کے پانی پر منحصر ہے، ان کا حال ابتر ہوجائے گا۔ نیز 2035 تک ہمالیائی گلیشیروں کا جو ایشیا کی 1.5 بلین آبادی کو پانی فراہم کرتے ہیں۔ حال یہ ہوگا کہ وہ معدوم ہوسکتے ہیں۔ 2080 تک عین ممکن ہے کہ مزید 400 ملین افراد ملیریا جیسی بیماریوں کے گھیرے میں آجائیں۔ دنیا کے درجۂ حرارت میں اضافے کا سب سے زیادہ اثر ہندوستان جیسے ترقی پذیر ممالک پر پڑ رہا ہے اور بین الاقوامی برادری کے ایک ذمے دار رکن کی حیثیت سے وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کا کہنا ہے کہ ہندوستان ماحولیاتی تحفظ کے لیے مثبت قدم اٹھائے گا۔ وزیراعظم نے یہ بھی کہا کہ ''ترقی پذیر ممالک میں غریبی کی قیمت پر ماحولیاتی تبدیلی کے مسئلے سے نہیں نمٹا جاسکتا۔ اس وقت ترقی یافتہ ممالک نہ رقم اور نہ ہی نئی ٹیکنالوجی دے رہے ہیں، نیز وہ کیوٹو معاہدے میں مختص کیا گیا نشانہ بھی پورا نہیں کر رہے ہیں، تو پھر ترقی پذیر ممالک سے وہ لچیلے پن کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں؟ اس لیے ماحولیاتی تبدیلی سے متعلق کوئی بھی معاہدہ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کے ضابطے کے مطابق اور Bali Roadmap کے دائرے میں ہی ہونا چاہیے، جس پر خود اقوام متحدہ بھی راضی ہے۔ اگر اقوام متحدہ کے ضابطے کا پاس نہ رکھا گیا تو کاربن کے اخراج کے معاملے پر پوری بات چیت ہی بے معنی ہوجائے گی، اور ترقی پذیر ممالک اپنے ذریعے دی گئی رضامندی کے مطابق کٹوتی نہیں کرتے ہیں تو ان پر جرمانہ لگانے کا انتظام ہونا چاہیے۔''

ماحول نے تحفظ کی کوشش اور بڑھتی ہوئی ماحولیاتی تپش نیز گرین ہاؤس گیسوں اور کاربن کے اخراج کو کم کرنے سے متعلق اقدامات اور مقدار کے تعین کے سلسلے میں اب تک ترقی یافتہ، ترقی پذیر، امیر، غریب اور جزائر (Islands) پر مشتمل چھوٹے چھوٹے ممالک کے درمیان جنھیں گلوبل وارمنگ کی بنا پر سمندر کی سطح میں ہو رہے بتدریج اضافے سے غرقابی کا خطرہ درپیش ہے، کوئی سیاسی معاہدہ عمل میں آنا تو درکنار اس بات کے امکانات بھی قوی ہوگئے ہیں کہ اس سنگین عالمی مسئلے کے حل کو 2010 میں ہونے والی میکسیکو (Mexico) کانفرنس تک کہیں ملتوی نہ کرنا پڑ جائے۔ ترقی یافتہ ممالک گرین ہاؤس گیسوں کی تخفیف کے سلسلے میں ترقی پذیر ممالک کی جانب سے خانگی سطح پر کیے جانے والے اقدامات کی بین الاقوامی جانچ پڑتال کی مانگ کر کے مستقبل

میں ان پر ایک غیر متناسب کاربن ایجنڈا ابھی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

اپنے ملک ہندوستان کے مختلف شہروں کا جائزہ لے لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ موسمی تغیرات نے کیا کیا مسائل کھڑے کیے ہیں۔ مرکزی وزیر ماحولیات مسٹر جے رام رمیش نے نئی دہلی میں دی انرجی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (TERI) کی جانب سے "Green India 2047" کے موضوع پر منعقدہ ایک پروگرام میں یہ سخت ریمارک دیا کہ اگر گندگی اور غلاظت کے لیے کسی ملک کو نوبل انعام دیا جاتا تو ہندوستان کو یہ نوبل انعام ضرور ملتا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے شہر دنیا کے سب سے گندے شہر ہیں۔ دراصل گرین انڈیا 2047 کے تحت جاری کردہ رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آلودہ ہوا اور گندا پانی ملک میں ہر سال 8 لاکھ اموات کے ذمے دار ہوسکتے ہیں۔ بقول وزیر ماحولیات ''45 فیصد ہندوستانیوں کو پینے کا محفوظ پانی میسر نہیں۔'' ہندوستان کی آبادی اس وقت 1198 ملین ہے، تاہم کہا جاتا ہے کہ آبادی کے معاملے میں ہندوستان 2050 تک چین کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ سوشل پروٹیکشن انڈیکس (SPI) میں ہندوستان اپنے پڑوسی ملک چین سے اوپر ہے، کیوں کہ وہ سماجی تحفظ سے متعلق امور جیسے کہ صحت عامہ، تعلیم اور بچوں کی دیکھ بھال کے معاملات میں اس سے زیادہ بہتر ہے۔ کہیں پانی کی زیادتی تو کہیں پانی کی شدید ترین قلت۔ شہر بنارس میں پانی کی قلت کی وجہ سے خطرے کا الارم بج چکا ہے۔ جہاں زیر زمین آبی سطح سالانہ 90 سینٹی میٹر کی رفتار سے گھٹ رہی ہے۔ گنگا کی آبی سطح اوسط سے 5.5 میٹر نیچے پہنچ چکی ہے۔ جب تک روئے زمین پر انسانی وجود ہے، تب تک پیاس بھی ہے اور یہ پیاس پانی سے ہی بجھے گی، اس لیے پانی کے بے قابو اتلاف پر بھی سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کیوں کہ پانی کی قلت روز بروز ہولناک صورت اختیار کررہی ہے۔

ماحولیات کی تباہی دراصل عہد جدید کے انسان کی اس کوشش کا خمیازہ ہے جس کے تحت وہ قدرتی ماحولیات کو الوہی ماحولیات سے علیحدہ کرکے فلسفۂ وجود کی رو سے حقیقت کے ایک آزادانہ نظام کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ حیاتیاتی تنوع (Biodiversity) کا احترام ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ آلودگی کو اس کے منبع پر ہی نشان زد کیا جائے، تحفظاتی قوانین کا نفاذ اور توانائی کا تحفظ اور وسائل کے ضیاع سے گریز لازمی ہے، اپنی ضرورتوں کو لگام دے کر نیز وسائل کے ضیاع پر قدغن لگا کر فطری توازن کو برقرار رکھنے کے مسائل پر مناسب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

□□□

پتہ:
161/32, Jogabai,
Jamia Nagar,
New Delhi-110025

عبدالحلیم شرر — بحیثیت ناول نگار

مصنف: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں مصنف نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے جائزے میں شرر کے حالاتِ زندگی، خاندانی پس منظر، ملازمتوں اور علمی مشاغل، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اولین اشاعت جیسے امور سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صفحات: 393، قیمت -/165 روپے

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی و ادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت ومقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس وتدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت -/66 روپے

مجیب الرحمٰن

موسم، آب و ہوا اور فضا کی بہتری کے لیے

ہر سال مارچ کے مہینے میں WMO یعنی ورلڈ میٹرولوجیکل آرگنائزیشن اور اس کے 188 رکن ممالک ''عالمی یوم موسمیات'' مناتے ہیں۔ دراصل یہ دن 1950 میں عالمی ادارۂ موسمیات کے قیام کی یاد دلاتا ہے۔ اسی ماہ، اسے اقوام متحدہ کے ایک خصوصی ادارے کی حیثیت حاصل ہوئی تھی۔ آج اس کے حلقۂ اختیار اور ذمے داریوں میں پانی اور ماحولیاتی مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں اور ہر سال عالمی یوم موسمیات کسی خاص عنوان کا احاطہ کرتا ہے۔ اس سال کا عنوان تھا ''موسم آب و ہوا اور فضا، جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔'' یہ عنوان اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس وقت کرۂ ارض کی تمام اقوام، چند اہم اہداف کے حصول کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ خاص طور پر، صحت، خوراک، پینے کے صاف پانی، غربت کے خاتمے اور قدرتی آفات سے بچاؤ کے لیے۔ چونکہ 90% سے زائد آفات کا براہِ راست تعلق ''موسم آب و ہوا اور پانی'' سے ہوتا ہے لہٰذا طبی ماہرین اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ موسم، آب و ہوا اور فضا میں شامل گیسوں کا براہِ راست اثر انسانی صحت پر ہوتا ہے۔

بنی نوع انسان نے صدیوں تک موسم اور آب و ہوا کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے، جن میں رہائش، غذا، توانائی اور رہنے سہنے کے طریقوں کو موسم اور ماحول کے مطابق ڈھالنا وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن گذشتہ چند دہائیوں سے آبادی میں اضافے اور صنعتی ترقی کے باعث کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی مضرِ صحت گیسوں سے انسانی صحت بری طرح متاثر ہوئی ہے ہوا میں زہریلی گیسوں کے شامل ہونے سے دمے، دل اور پھیپھڑوں کے امراض میں اضافہ ہوا ہے۔ مزید برآں فضائی آلودگی کے باعث، پودوں، اور فصلوں کو بے حد نقصان پہنچا ہے جس کے باعث عالمی معیشت پر بھی خطرناک اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ بقراط نے جسے بابائے طِب کہا جاتا ہے، توہم پرستی کو سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر مسترد کرتے ہوئے بیماریوں کی درجہ بندی کی اور اخلاقی اور پیشہ ورانہ معیار قائم کیے جو آج بھی کارآمد ہیں۔ اس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں ہوا، پانی اور علاقائی ماحول کے انسانی صحت پر اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ بقراط کے زمانے میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ کُل عناصر صرف چار ہیں، مٹی، ہوا، پانی اور آگ اگر ان کی صفات یعنی سرد، خشک، نم اور گرم۔ انسانی جسم کے متعلقہ اعضا میں صحیح مقدار میں موجود ہوں تو صحت اچھی رہتی ہے لیکن اگر ان میں توازن برقرار نہ رہے تو صحت کا توازن بھی بگڑ جائے گا۔ آج ہم جانتے ہیں کہ فضا میں جن گیسوں اور ذرات کی مقدار کم یا زیادہ ہوتی ہے ان کا آب و ہوا اور موسم پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے ماہرین موسمیات و ماحولیات ان گیسوں اور ذرات کی کمی بیشی کے باعث ہونے والے اثرات کے سدِ باب کے لیے دن رات کوششیں کر رہے ہیں۔

1950 کی دہائی میں قائم ہونے والا یہ اولین ادارہ تھا جس نے فضائی اجزا کے مشاہدے اور تجزیے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ پھر گرین ہاؤس گیسوں، فضائی ذرات اور اوزون پرت کے بارے میں باقاعدگی سے معلومات اکٹھی کی جانے لگیں۔ رصدگاہوں اور مصنوعی سیاروں کے بین الاقوامی نیٹ ورک کے ذریعے نہ صرف یہ کہ فضا کی کیمیائی ساخت میں تبدیلی کو سمجھنے میں مدد ملی بلکہ ہوا کی کوالٹی پر موسم کے اثرات کے حوالے سے سائنسی معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ یہ سائنسی مطالعے، رکن ممالک کے قومی، موسمیاتی اور آبی اداروں نے دیگر بین الاقوامی اداروں کے ساتھ مل کر تیار کیے۔ اس ضمن میں عالمی ادارۂ موسمیات (WMO) بے حد مستعدی کے ساتھ بین الاقوامی کوششوں میں شامل رہا تاکہ فضائی تبدیلیوں کو بہ لحاظ آلودگی بھی جانچا جا سکے اور گرد و غبار، سلفر آکسائیڈ اور کاربن مونو آکسائیڈ وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکیں جن کا انسانی صحت سے گہرا تعلق ہے۔

عالمی ادارۂ موسمیات نے فضائی ساخت سے متعلق تین بین الاقوامی اداروں کے قیام کے سلسلے میں بھی بانی کا کردار ادا کیا ہے۔

آب و ہوا میں تبدیلی کے اسباب میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ہونے والی ماحولیاتی آلودگی بھی شامل ہے لیکن یہ اس قدرتی تبدیلی سے ہٹ کر ہے جو ہم فلکیاتی اور جغرافیائی اثرات کے نتیجے میں دیکھتے ہیں۔ اس ضمن میں انٹرنیشنل پینل آن کلائمٹ چینج نے 2007 میں اپنی چوتھی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے مطابق آب و ہوا کی تبدیلی ہر جگہ یکساں نہیں لیکن اس کا سبب ایک ہی ہے، فضا میں خارج ہونے والی گرین ہاؤس گیس۔ سیلاب قحط سالی اور دیگر موسمیاتی انتہاؤں کی شدت اور فریکوینسی میں اضافہ ہوا ہے جو گلوبل وارمنگ کا نتیجہ ہے گرم ہوائیں جو انسانی صحت اور ماحولیات پر شدید اثرات مرتب کرتی

ہیں جنگلات میں آگ لگنے کی ذمے دار ہیں۔ ہوا، بارش اور برف باری، سورج کی روشنی اور درجۂ حرارت، یہ چیزیں فضائی آلودگی کی نقل وحرکت پر کئی طرح سے اثر انداز ہوسکتی ہیں۔ شہروں کی گرم ہوا، فضائی آلودگی کو روکے رکھ سکتی ہے جبکہ بارش اور برف باری اس آلودگی کو فضا سے دھوکر زیر زمین اور سمندر میں بھیج سکتی ہے ان کی پیمائش کے لیے سائنس دان میٹرولوجیکل ماڈلز استعمال کرسکتے ہیں۔ اس طرح موسموں سے متعلق درست پیش گوئی کی جاسکے گی اور ایئر کوالٹی کی بروقت اور درست پیش گوئی انسانی جانوں اور املاک کو بچانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

دراصل یہ ایک مشترکہ جدوجہد ہے، جس میں ہر فرد کا تعاون بے حد ضروری ہے۔

□□□

پتہ:
550, Churi Walan,
Delhi-110006

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کرلینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

مندیپ سنگھ سوئن

ہمالیہ کا بُلاوا

"...... کیونکہ یہ یہاں ہے۔" جارج مالوری نے یہ اس وقت کہا تھا جب 1924 میں ان سے سوال کیا گیا تھا کہ آپ ماؤنٹ ایوریسٹ پر کیوں چڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ چار لفظ کوہ پیائی کی تاریخ میں سب سے مشہور لفظ بن گئے۔

تقریباً 29,000 فٹ کی بلندی پر واقع وہ مقام جہاں ماؤنٹ ایوریسٹ ہے، دنیا کا سب سے اونچا اور سب سے زیادہ چنوتی بھرا قطعۂ زمین ہے جو کوہ پیاؤں، بلند چوٹیاں سر کرنے والوں اور مہم جوئی کرنے والوں کے لیے باعثِ کشش ہے۔ دنیا کے پہاڑوں میں سب سے بلند ہونے کے باعث یہ ایک ایسا قطعۂ زمین ہے جہاں قطعی منفرد کلچر ملتا ہے، بعض جگہ اتنا الگ تھلگ کہ وہاں پہنچنے والے سمجھتے ہیں کہ ان حسین نباتات و حیوانات تک پہنچنے والے وہ اولین افراد ہیں۔ یہ سب خصوصیات مل کر ہمالیہ کو جاہ و جلال اور آن بان بخشتی ہیں۔ اور کون ایسا ہوگا جو ایسے مقام تک رسائی حاصل کرنے کا خواہشمند نہ ہو؟

ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کا مختلف النوع قطعۂ زمین ان سبھی کو موقع فراہم کرتا ہے جو بلند چوٹیاں سر کرنے کی کوشش کرتے یا اس کا تجربہ کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ کوہ پیائی کے لیے لازمی طور پر پیشہ ورانہ تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس لیے اس میں ہلکی پھلکی چڑھائی اور کم تکنیکی معلومات شامل ہوتی ہیں اور یہ کئی دنوں پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے جیسا کہ کوہ پیائی کی مہم ہوتی ہے۔ کوئی فرد نشیبی ہمالیہ یا بالائی پہاڑیوں پر کوہ پیائی کے ذریعے ابتدائی چڑھائی یا مختصر کوہ پیائی کا انتخاب کرسکتا ہے۔

ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ روایتی اعتبار سے دو خطوں میں بٹا ہوا ہے: مغربی ہمالیہ اور مشرقی ہمالیہ۔ جموں و کشمیر، ہماچل پردیش اور اتراکھنڈ کی ریاستوں کا پہاڑی سلسلہ مغربی کوہستان ہے جبکہ سکم اور اروناچل پردیش کا پہاڑی سلسلہ مشرقی کوہستان ہے۔

لداخ اور زنسکار اور حسین وادیٔ کشمیر پر مشتمل منفرد ارضی منظر کا وطن جموں و کشمیر کوہ پیاؤں کے لیے آج بھی سب سے پرکشش مقام ہے۔ لداخ۔ زنسکار وادی میں کئی کوہستانی علاقے ہیں جن پر مبتدی آغاز کرسکتے ہیں اور کئی ایسی دشوار گزار پہاڑیاں ہیں جن پر چڑھنے کی اکثر کوہ پیا کوشش کرتے ہیں۔

زنسکار وادی میں سب سے مشہور برفانی کوہستان ہے جو کوہ پیاؤں کو منجمد زنسکار دریا پر ٹریکنگ کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ چنوتی بھرے اور دلچسپ ترین تجربات میں سے ایک ہے۔ اس کوہستانی علاقے میں سفر کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ منالی سے لیہہ تک کوئی سفاری جیپ لی جائے، جو ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے اور بدلتے ہوئے سطح ارتفاع اور آب و ہوا کے موافق خود کو تیار کرنے میں کوہ پیا کے لیے معاون ہوتی ہے۔ کوہ پیاؤں کی اولین پسند وادیٔ کشمیر میں کشت واڑ اور پہلگام سیکٹر ہیں۔ البتہ آج کل کوہ پیائی کے لیے یہ زیادہ رائج نہیں ہے۔ مارکھا وادی کا کوہستانی علاقہ کوہ پیائی کے سب سے مشہور مقامات میں سے ایک ہے جو کہ دس دن کے ٹریکنگ پر مشتمل ہے جس کا آغاز و اختتام لیہہ میں ہوتا ہے۔ یہاں دو یا تین دن کی کوہ پیائی کے لیے مختصر علاقے بھی ہیں جو قدرے کم محنت طلب ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے دہلی سے بڑھتے ہوئے فضائی رابطے کے سبب یہاں پہنچنا زیادہ آسان ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں عالمی وائلڈ لائف فنڈ، سنو لیپرڈ کنزروینسی اور ریاستی سیاحتی بورڈ کی جانب سے علاقے کے تحفظ اور بچاؤ کے لیے ماحولیاتی سیاحت کے سلسلے میں کئی اقدامات کیے گئے ہیں۔

ہمالیہ کے کوہستانی علاقے میں کوہ پیائی ایک زبردست تجربہ کیوں ہے، اس کی اہم وجوہات میں سے ایک وجہ کوہستانی علاقے کا تنوع ہے جس کا تجربہ کوہ پیاؤں کو مختصر، طویل، آسان اور مشکل ٹریکنگ کے دوران ہوتا ہے۔

ہر ٹریک مکمل تنوع کا حامل ہے، نشیبی پہاڑیاں، بلند درّے، سیدھے راستے، انتہائی بلندی پر واقع درّے، ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں جو کسی کوہ پیا کے لیے آزمائش کا باعث ہیں۔

ہماچل پردیش کے کوہستانی علاقے میں وادیٔ کلو، کنّور اور اسپتی اور لاہول شامل ہیں۔ یہ علاقے شاداب جنگلات، سنگلاخ قطعۂ زمین، بلند درّوں پر ٹریکنگ کی دعوت دیتے ہیں، جن کے ٹریک چندرتال جھیل پن پاروتی اور کنیر کیلاش سرکٹ سے ملتے ہیں۔ مقامی افراد کی شمولیت سے گھروں پر قیام کی اسکیم خاصی کامیاب ہورہی ہے اور یہ ہر اس فرد کے لیے حوصلہ افزا ہے جو اس علاقے کے دورے کا خواہشمند ہے۔

ہمالیہ کوہستانی علاقے میں سب سے زیادہ کھلی چوٹیوں کا مسکن (وہ چوٹیاں جو کسی قومی پارک یا اسی طرح کی کسی اور تنظیم میں نہیں ہیں) اتراکھنڈ کی گھڑوال وادی ہے جس میں کئی بلند چوٹیاں، پھولوں سے لدا اور گھنا سبز جنگلاتی علاقہ ہے۔ یہ قطعۂ زمین کوہ پیاؤں کے لیے زبردست کشش رکھتا ہے اور اس میں استوپ ناتھ اور ترشول نامی چوٹیاں کوہ پیائی کے لیے سب سے زیادہ مشہور

ہیں۔ رانی کھیت اور رمنسیاری سے ذرا دوری پر واقع علاقہ کوہ پیمائی کے لیے بہترین ہے جس میں دریائے گنگا کے مخرج والا علاقہ بھی شامل ہے۔ میرو پہاڑ (ہندو اساطیر کے مطابق میرو پہاڑ کو دنیا کا مرکز مانا جاتا ہے) اور شِولنگ پر ایک برس میں تقریباً 10 سے 12 مہمات سر کی جاتی ہیں۔ کماؤں علاقے میں مشہور نندا دیوی پہاڑی اور پنچولی کوہستان کے ٹریک ہیں۔ مشہور ٹریک جیسے لارڈ کرزن ٹریک، شیشوں تل مین ٹریک اور دیگر آپ کو نچلے علاقے سے ان بالائی پہاڑوں پر لے جاتے ہیں جہاں آپ بلند ترین چوٹیوں کا حواس گم کر دینے والا نظارہ کر سکتے ہیں۔ ریاستی حکومت ضروری بنیادی ڈھانچے کی تعمیر اور راستے بہتر بنانے کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس نے اجازت نامہ حاصل کرنے کے عمل میں لگنے والے وقت کو تین مہینے سے گھٹا کر تین ہفتے کر کے اس عمل کو آسان بنا دیا ہے۔ ماحولیاتی سیاحت کو متعارف کرانے کی کوششیں، بنیادی ڈھانچے کی تعمیر، جنگلات کا تحفظ، نئی پگڈنڈیاں کھولنا ریاست کی جانب سے کیے گئے تازہ اقدامات ہیں۔ ریاست کی سیاحتی اتھارٹی نے ایڈونچر سیاحت پر توجہ مرکوز کرنے کا اعلان کیا ہے اور وہ اس سلسلے میں کام کر رہی ہے۔

ملک کے شمال مشرق میں سکم اور اروناچل پردیش کے ٹریک دور افتادگی کے احساس اور گھنے استوائی جنگلات میں پیش قدمی کی دعوت کی علامت ہیں۔ مشرقی پہاڑیوں کی گزرگاہ مغربی بنگال کا کولکتہ ہے۔ سکم مسحور کن ہے اور اپنے گوئی چالا ٹریک کے لیے مشہور ہے جو کوہ پیماؤں کو دنیا کے سب سے بلند پہاڑ کنچن جنگا کے نچلے حصے کے بہت قریب لے جاتا ہے۔ اروناچل پردیش مختلف النوع حیوانات و نباتات کے ساتھ اپنے گھنے استوائی جنگلات میں مختصر ٹریک کی دعوت دیتا ہے۔ ان جنگلات میں قبائل آباد ہیں جنھوں نے اب کوہ پیماؤں کو خوش آمدید کہنا شروع کر دیا ہے۔

کوہ پیمائی کا بیڑا اٹھانے کے لیے وقت لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جلد بازی کا کام نہیں ہے۔ اس تجربے کو سمجھنے اور پروان چڑھانے کے لیے کوہ پیما کو خاصا وقت صرف کرنا ہوتا ہے اور سب سے اہم یہ ہے کہ وہ منظم طریقے سے علاقوں کی بازیافت کرے۔ ہندوستان میں آنے والے کوہ پیماؤں کی مستقل بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر وزارت سیاحت، ریاست کے سیاحتی اداروں، منظّم شعبے اور غیر منظّم شعبے کے ٹور آپریٹرز نے خدمات بہم پہنچانے کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ان علاقوں میں آسان رسائی کو یقینی بنانے کے لیے مل کر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ یہ تمام علاقے ماحولیاتی اعتبار سے حساس ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تحفظاتی ہدایات اور بہترین طریقۂ کار پر عمل کیا جائے۔ (بہ شکریہ "ہندوستانی تناظر" نئی دہلی، اپریل۔ جون **2009**)

کلیات راجندر سنگھ بیدی — جلد اول، جلد دوم

مرتب: وارث علوی

کلیات راجندر سنگھ بیدی کی پہلی جلد میں افسانے اور دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین، انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات، تنقیدیں اور مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں۔ جلد اول میں مرتب نے راجندر سنگھ بیدی کی زندگی اور شخصیت کے علاوہ بیدی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے ساتوں مجموعے — دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ اور اس کے علاوہ بیدی کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ دوسری جلد میں ان کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے — بے جان چیزیں اور سات کھیل جن میں گیارہ ڈرامے ہیں۔ اس دوسری جلد میں بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

جلد اول: صفحات : 1040، قیمت : -/525 روپئے/ جلد دوم: صفحات : 655 قیمت : -/380 روپئے

دکنی لغت

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرّہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات — 521، قیمت — 590 روپئے

دویک کمار سنگھ اور وجے سنگھ

جیولوجی میں کیریئر

جیولوجی ایک ایسی سائنس یا آرٹ ہے جو جواہرات کی پرکھ سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی ہیرے جواہرات اصلی ہیں یا نقلی، اس کی شناخت کے لیے جس طریقے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ ایک مخصوص علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس پورے عمل کو جیولوجی کہتے ہیں۔ جیولوجی کا تعلق دراصل معدنیات کی شناخت سے ہے، کیونکہ ہماری زمین میں بہت Layers ہیں۔ کچھ معدنیات رقیق کی شکل میں ہیں تو کچھ ٹھوس شکل میں۔ سونا، چاندی، ہیرے یہ مختلف قسم کی معدنیات ہیں۔ انسانی ضرورتوں اور پسند کے لحاظ سے ان معدنیات کی درجہ بندی کی جاتی ہے اور ان معدنیات کی قدر و قیمت Purification کے عمل سے گزرنے کے بعد ہی سامنے آتی ہے۔ جیولوجی کی تعلیم ایک خاص تعلیم ہے جس میں جیولوجسٹس معدنیات کی زمرہ بندی اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو تلاش کر کے ان کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ جواہرات کی کشش نے انھیں صدیوں سے آرائش و زیبائش کا سامان بنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جیم اسٹون (Gem Stone) (یعنی قیمتی پتھر) دنیا کے ہر حصے میں زیورات او رنمائشی ساز وسامان میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مخصوص چٹانیں (جیسے لیپس لیرولی) اور آرگینک میٹریلز (جیسے امبر یا جیٹ) معدنیات میں شامل نہیں لیکن یہ زیورات میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کو جواہرات ہی کے مماثل سمجھا جاتا ہے۔ زیادہ تر جیم اسٹون سخت ہوتے ہیں لیکن کچھ نرم اقسام بھی ہوتی ہیں اور ان کی چمک دمک اور دلکشی کی وجہ سے انھیں زیورات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

جواہرات کیونکہ آسانی سے نہیں ملتے اور بعض تو بہت ہی کم یاب ہیں۔ اسی بنیاد پر جواہرات کی قیمت طے ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ جواہرات نایاب بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی اُس قسم کو دوبارہ دریافت نہیں کیا جا سکا ہے۔

جیم اسٹون کی بنیادی زمرہ بندی ان کے کرسٹلوں (Cristils) کی بناوٹ اور مخصوص گریویٹی (Gravity) سے کی جاتی ہے۔ جیولوجسٹس جب کسی Gem Stone کی قیمت کا تخمینہ لگانے میں یا جیم اسٹون کی تراش اور پالش کا جائزہ لیتے ہیں تو مائیکرواسکوپ کے ذریعے اس کی قدرتی اندرونی ساخت کو دیکھتے ہوئے یہ شناخت کر پاتے ہیں کہ یہ Stone اصلی ہے یا نقلی۔

کسی تراشیدہ جیم اسٹون کا اسپیکٹرواسکوپک انالسز (Spectro Scopic Analysis) بھی جیولوجسٹس کو اس کے اٹامک اسٹرکچر (Atomic Structure) کو سمجھنے اور اس کی شناخت کر کے اصل قیمت جاننے میں مدد کرتا ہے۔ مثلاً برما کے نیلم کی اندرونی ساخت اور دلفریبی تھائی لینڈ کے نیلم سے علیحدہ ہوتی ہے۔ جب جیم اسٹون خام ہوتا ہے۔ اس وقت جیولوجسٹس اس کے باہری اسٹرکچر (Structure) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی چٹان، معدنیات کے ملان، قدرتی رنگ، رنگوں کی چمک دمک نمایاں نظر آنے والی خصوصیات اور اندرونی ساخت کو مائیکرواسکوپ کے ذریعے بڑا کر کے اس کا مطالعہ اور زمرہ بندی کی جاتی ہے۔ آج بھی بیش قیمت جواہرات اگر کسی کے پاس ہیں تو وہ اس کی شان بڑھاتے ہیں۔ یہ دولت کی ایک مخصوص شکل ہے جو خوش نصیبی سے بھی تعبیر کی جاتی ہے۔ ہمیشہ سے بادشاہوں اور رئیس لوگوں کے پاس یہ دولت موجود رہی ہے بدلتے فیشن اور پسند کے لحاظ سے لوگ زیورات کے روایتی اسٹائل کو بھولتے جا رہے ہیں اور آہستہ آہستہ نئی چیزوں کی طرف مائل ہو رہے ہیں جو آج کی مصروف زندگی سے مطابقت رکھتی ہیں۔

ہندوستان دنیا بھر میں ہیروں کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ یہاں ہیرے تراشنے کی بہترین تکنیک موجود ہے۔ اس لیے یہاں جواہرات کا علم کیریئر کے اطمینان بخش اور بہتر مواقع فراہم کر سکتا ہے۔ جیولوجی کورس میں داخلے کے لیے 10+2 یا گریجویشن اور انگریزی بولنے کی صلاحیت لازمی ہے۔ کیونکہ اس کیریئر میں بیرونی گاہکوں سے بھی بات کرنی ہوتی ہے۔ مزید برآں اس مضمون کی تمام کتابیں زیادہ تر انگریزی میں ہیں۔

جیولوجسٹس جواہرات کی شناخت کرتے ہیں اور ان کی درجہ بندی کرتے ہیں، وہ جوہریوں کو مشورے دیتے ہیں کہ کون سا پتھر قیمت اور ساخت کے لحاظ سے کس طرح کے زیور کی بناوٹ کے لیے مناسب رہے گا۔ یعنی جیولوجسٹ کے کام میں مختلف قیمتی پتھروں کی شناخت کرنا، ان کا وزن معلوم کرنا، سائز، بناوٹ، اور دیگر متعلقہ امور کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔ آپ ایک جیم گرائنڈر، جیم پولش، جیم اسورٹر، اینگریور، جیولری سیلز، ریسرچ اور سائنٹسٹ کی حیثیت سے مہارت حاصل کر سکتے ہیں اور لوگوں کو درس و تربیت بھی دے سکتے ہیں بشرطیکہ آپ مطلوبہ اہلیت و تجربے کے حامل ہوں۔

ایک کامیاب جیولوجسٹ بننے کے لیے آپ میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ آپ میں ڈیزائن کی خوبیوں کی سمجھ، معیار کی پرکھ، باریک بینی، تیز نظر، پریسی شن کی تفاصیل سے آگاہی، اس کی خوبیوں اور خصوصیات سے واقفیت ضروری ہے۔ طلبہ کو پتھروں سے متعلقہ مختلف موضوعات پڑھائے جاتے ہیں مثلاً

☆ پتھروں کی شناخت اور پتھروں کے رنگ کی بنیاد پر انکو چھانٹنا اور ان کی زمرہ بندی کرنا۔

☆ پتھروں کی دستیابی

☆ پتھروں کی نظری خصوصیات

☆ قدرتی جواہرات کی شناخت

☆ ڈیزائن کا طریقہ کار

☆ میٹل کا تصور ڈرائنگ ٹیکنکس

☆ زیورات کی ڈیزائننگ، کمپیوٹر کی مدد سے ڈیزائننگ

☆ میٹلر جیکل پروسیس (Metalergical Process)

روایتی اور جدید طریقوں سے زیورات کی تیاری۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی جواہرات کو تراشنے والے افراد اور دستکاروں کی دنیا میں بہت قدر ہے۔ ساتھ میں سرکار کی جانب سے دی جانے والی سہولیات نے ان کے لیے ملک اور بیرون ملک میں دروازے کھول دیے ہیں۔ روزگار میں جے پور (راجستھان) دنیا کے بڑے جواہرات تراشنے والے مراکز میں سے ایک ہے۔ دیگر مراکز میں دہلی، ممبئی، سورت اور احمد آباد شامل ہیں۔ ان شہروں میں قائم بہت سے ایکسپورٹ ہاؤسیز میں ان افراد کو عمدہ اسامیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ مصنوعی جواہرات کی آمد اور بدلتے فیشنوں اور مغربی طرز کے ڈیزائنوں میں بڑھتی دلچسپی کے مواقع میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ اگر آپ بازار کی ضرورت کے مطابق نگا تارنئی اشیا تیار کر سکتے ہیں تو آپ ترقی کی منازل طے کر سکتے ہیں اور آپ کے لیے از خود روزگار کے دروازے بھی کھل جائیں گے۔

کام کے مواقع:

قیمتی پتھروں سے بنے زیورات کی بڑھتی مانگ نے جیولوجسٹس کی مانگ میں بھی اضافہ کیا ہے۔ کوئی بھی فرد جس کو زیورات اور پتھروں سے دلچسپی ہے اور جو باریک بینی سے تفاصیل کو پرکھ سکتا ہے، وہ ایک کامیاب جیمولوجسٹ بن سکتا ہے۔ آج کے دور میں مصنوعی زیورات کی آمد نے اس پیشے میں نئے مواقع دستیاب کرائے ہیں اور جب جواہرات اور زیورات کے ایکسپورٹ کی بات آتی ہے تو بھارتی ایکسپورٹ کا حصہ پوری دنیا میں تقریباً 70% ہے۔ بین الاقوامی بازار میں روایتی سونے کے زیورات کی بھی مانگ ہے۔ جس کی بنا پر بھارتی جواہرات اور زیورات کی صنعت میں کام کے زیادہ مواقع دستیاب ہوئے ہیں۔ مصنوعی زیورات کی آمد نے کام کے مواقع میں بہت اضافہ کیا ہے۔

ہنرمند کاریگروں کے لیے ملازمت کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس میں آپ کے کام کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ تنخواہیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ اختراعی نوعیت کے کام پر آپ کو شروع میں 15000 روپئے ماہانہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس بزنس سے جڑے افراد جیمز اور جواہرات کے ہول سیلز بن سکتے ہیں یا زیورات کی دوکان کھول سکتے ہیں۔

بھارت میں سستے مزدوروں کی موجودگی کی بنا پر ایک اندازہ ہے کہ ہر 10 جواہرات میں سے 9 بھارت میں تراشے جاتے ہیں۔ اس لیے ملازمت کے مواقع زبردست ہو سکتے ہیں۔ اس شعبے میں انٹرنیشنل جیمولوجیکل انسٹی ٹیوٹ (آئی جی آئی) جو بڑا اور خود مختار جیم سرٹیفکیشن اور اپریزل انسٹی ٹیوٹ ہے اس کی جیمولوجیکل لیباریٹریز اینٹورپ (بیلجیئم)، نیویارک، (یوایس) اور بینک کاک (تھائی لینڈ) میں ہیں، اس نے ممبئی میں اپنا ادارہ قائم کیا ہے تاکہ اس شعبے میں بھارت کی زبردست صلاحیت کو تسلیم کیا جا سکے۔ بہت سے دیگر جیمولوجیکل انسٹی ٹیوٹ گذشتہ عرصے میں بھارت میں قائم کیے گئے ہیں۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فیشن ٹیکنالوجی (این آئی ایف ٹی) کی درج ذیل برانچیز ہیں۔

☆ این آئی ایف ٹی کیمپس، نزد گل مہر پارک، حوض خاص، نئی دہلی

☆ ٹاٹا ملز، پریل ممبئی (مہاراشٹر)

☆ سیکٹر III سالٹ لیک سٹی، کولکاتا (مغربی بنگال)

☆ جی آئی ڈی سی الیکٹرانک اسٹیٹ، گاندھی نگر گجرات

☆ چیتنیا بھون، نام پلی، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

☆ کو۔ آپٹکس بلڈنگ، ایگمور، چنئی (تامل ناڈو) □□□

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت -/45 روپئے

ڈی.ڈی.کوسمبی/ بالمکند عرش ملسیانی (ہماری مطبوعات سے)

عصرِ ماقبل کی تاریخ اور حیاتِ قدیمہ

ماہرِ آثار قدیمہ کی دریافتیں ہمیں ازخود یہ نہیں بتاتیں کہ کسی خاص زمانے کے لوگ واقعی کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اس طرز زندگی (پوری ثقافت) کا خاکہ ازسرِ نو مرتب کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دنیا کے الگ تھلگ اور دور افتادہ مقامات پر جو بہت سے مختلف قدیم قبائل باقی رہ گئے ہیں ان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ تب رفتہ رفتہ یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ایک خاص زمرے کے اوزار کس طرح بنائے گئے اور استعمال کیے گئے اور اس کے بنانے والے ماضی بعید میں کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ جب سماجی نظام وجود میں آگیا تو اسی طرح کچھ نہ کچھ سماجی نظام کے متعلق بھی بتایا جاسکتا ہے لیکن کم تیقن کے ساتھ۔ خود یہی حقیقت کہ آسٹریلیا اندرون برازیل میں ایک قدیم ابتدائی قبیلے کا مطالعہ ممکن ہے یہ معنی رکھتی ہے کہ اہلِ قبیلہ کا باہر کی دنیا سے اور بطور نتیجہ بیرونی تہذیب سے کچھ رابطہ رہ چکا ہے۔ ایسا ماننا ہی پڑے گا کیونکہ کوئی رابطہ بغیر تغیر نہیں ہوسکتا۔ دوسرے کوئی انسانی گروہ کسی حد تک ایک ہی مقررہ حالت میں نہیں رہ سکتا۔ یا تو ارتقا پاکر کوئی زیادہ اعلیٰ و بہتر صورت اختیار کرتے ہیں یا پژمردہ ہوکر ختم ہوجاتے ہیں۔ قبل تاریخ کے لوگ جن کا ہم مطالعہ کرنا چاہتے ہیں روئے زمین سے مٹ چکے ہیں۔ بعض گروہ اپنے بعد ایسے اخلاف چھوڑ گئے ہیں جو آگے بڑھ کر تہذیب حاضرہ تک آگئے اور بعض صفحۂ ہستی سے یکسر غائب ہوگئے۔ دور افتادہ گوشوں میں جو تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں انھوں نے کچھ خیالات، ذہنی انداز، توہمات، پوجاپاٹ کے طریقے اور رسم و رواج اس قسم کے پیدا کرلیے ہیں جو ان کی زندگی کے جدید طریقوں کا تجربہ کرنے سے روکتے ہیں۔ ہمارے عہد کے بیشتر وحشی گروہوں کا سماجی ڈھانچہ ایسا سخت اور بے لوچ ہے کہ ہر ایک جدت و بدعت کی ہمت فرسائی کرتا ہے حالانکہ سب کا ایک ہی سماجی ڈھانچہ نہیں ہے۔ کوئی مادہ پرست سماجی نشو و نما پر خیالات کے اثر کو نظر انداز کرنے کی قدرت نہیں رکھ سکتا۔

دنیا کے جن حصوں میں وسیع پیمانے پر کھدائی ہوچکی ہے وہاں کے اثریاتی ریکارڈ سے یہ تسلسل ظاہر ہوتا ہے۔ سب سے نیچے اور اس لیے سب سے قدیم حصے میں چھلے ہوئے پتھر کے بھدے ٹکڑے ہیں۔ یہ اوزار کے طور پر لکڑی اور ہڈی کے ساتھ ہوتے تھے جو کہ اب نابود ہوچکی ہے۔ اس قدیم حجری عہد نے ایک لاکھ سال یا اس سے بھی زیادہ مدت کے دوران پتھر کو چھیل کر اوزار بنانے کی تکنیک میں بہت سست ترقی کی۔ اس کے بعد پتھر کے صاف اور چکنے اوزاروں کا زمانہ (عہد جدید حجری) آیا۔ ان دونوں کے درمیان ''وسطی حجری عہد'' آیا یہ اصطلاح اب استعمال نہیں ہوتی۔ اس عہد کی حد اور مدت غیر متعین ہیں۔ زمین کی زیریں تہیں جن میں صرف پتھر کے اوزار تھے (اور قیاساً ہڈی لکڑی اور سینگ کے بھی وقت گزرنے پر دوسری تہوں کے نیچے دب گئیں جن میں دھات کے اوزاروں اور دھات کے ہتھیاروں کے باقیات تھے۔ سب سے پہلے جس دھات کا وسیع پیمانے پر استعمال ہوا وہ تانبا تھا جس کو ایک معمولی بھٹی کے ذریعے اس کی خام معدنی حالت سے پاک و صاف کر کے نکالا جاسکتا ہے۔ یہ بھٹی اس آوے سے زیادہ طاقتور نہیں ہوتی جس کی مٹی کے برتن تیار کرنے میں ضرورت ہوتی۔ مٹی کے برتن اواخر عہد حجری والے پتھر کے اوزاروں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ تانبا اتنا نرم ہوتا ہے کہ پگھلانے اور کوٹنے بغیر کارآمد نہیں ہوسکتا۔ اور اس پر بھی اس قدر رختہ و نازک ہوتا ہے کہ اگر کسی دوسری دھات مثلاً رانگ یا ٹین کی مناسب آمیزش نہ کی جائے تو کام نہیں دیتا۔ چونکہ رانگ کے ذخیرے وسیع پیمانے پر موجود نہیں اس لیے ''کانسی کا زمانہ'' بہت کچھ تحقیق و تلاش پر دلالت کرتا ہے تین ہزار قبل مسیح تک یا اس سے قبل ہی طویل فاصلوں پر تجارت کی سرگرمیاں پورے شباب پر آچکی تھیں۔ بہترین قسم کی کانسی نسبتاً کم یاب دھات تھی اور بہت کم لوگوں کے قبضے میں رہتی تھی۔ اس کے یہی معنی ہوئے کہ سماج متفرق طبقات میں بٹ چکا تھا۔ ''کانسی کے زمانے'' میں خام دھاتوں کے ذخیروں اور عمدہ آبی وسائل پر قابو پانے کے لیے بہت کافی جنگ و جدل ہوئی اور طویل فاصلوں پر چھاپے مارے گئے۔ دوسرے ہزار سال دورِ قبل مسیح میں (ایک ہزار تا دو ہزار ق.م) بے شمار قبائل بہت کافی لیکن متحرک غذائی رسد (عموماً مویشی) کے ساتھ نقل و حرکت میں

''قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں'' سے ماخوذ،

مصنف: ڈی.ڈی کوسمبی/مترجم: بالمکند عرش ملسیانی، صفحات.319، قیمت : -/73

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

تھے۔ اور یوریشیائی براعظم میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ دریائی وادیوں کی قدیم تر زرعی ثقافتیں اس سے ایک ہزار قبل ہی مصر اور میسو پوٹامیہ میں شہری ریاستوں، بادشاہتوں معبدی پیشوائیوں اور جنگ وجدل کے اداروں کو پروان چڑھا چکی تھیں اس طرح کی ترقی ونشوونما مقامی اور استثنائی تھی۔ موجودہ زمانہ عصریاتی اعتبار سے لوہے کا زمانہ ہے لوہا ایک کافی ارزاں اور وسیع طور پر ملنے والی دھات ہے جو زراعت کے لیے ایک عالمی امکان فراہم کرسکتی ہے اواخر عہد حجری میں کچھ زراعت ضرور نمودار ہوئی تھی اس لیے ہم ذرائع پیداوار میں ایک جدید حجری انقلاب'' کا نام لے سکتے ہیں لیکن چند مخصوص پسندیدہ علاقوں ہی تک محدود تھا، جہاں گھنے جنگلوں کو صاف کرنا ضروری نہیں تھا مثلاً میسو پوٹامیہ (عراق) مصر، وادیٔ سندھ، ایران کے مرتفع میداں ترکی، فلسطین۔ ولدی ڈینوب کی چکنی مٹی کے تنگ قطعہ کے بعض حصے اور شاید چین میں زرد چکنی مٹی کے بعض علاقے۔ اگر چہ لوہا جب پہلی بار تیار کیا گیا تو کانسی سے نرم تھا پھر بھی اس کے ذریعے جنگل صاف کیے جاسکے اور سخت تر مٹی میں ہل چلانا ممکن ہوسکا۔ یہ پہلی دھات تھی جو بہت سے لوگوں کو دستیاب تھی اور ایک مضبوط جنگ جو طبقے کے اجارہ میں نہیں تھی۔ اوّلین کسان جنھوں نے کتال ہیوک (ترکی) اور جیریکو (فلسطین) کے مقام پر قصبے تعمیر کیے۔ ان کا زمانہ سات ہزار ق.م. سے آٹھ ہزار ق.م. تک پہنچتا ہے۔ لیکن ان کے غذا پیدا کرنے کے طریقے قریب کے میدان میں وسیع پیمانے پر استعمال نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کی کاشت کاری مصر اور عراق کے برخلاف غذا اندوزی اور گلہ بانی کی محض ایک ضمیمہ اس وقت تک بنی رہی۔ جب تک دو ہزار ق.م. کے اواخر میں لوہا دستیاب نہ ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوہا تیار کرنے کے سب سے پہلے عمدہ طریقے حتیٰ کہ لوگوں کے اجارے میں تھے جس کی وہ سخت حفاظت کرتے تھے۔ یہ لوگ اس علاقے میں آباد تھے جو اب ترکی کہلاتا ہے 1450 ق.م. میں بھی لوہا اتنا کمیاب تھا کہ فرعون، طوطن، خامن ایک ٹھوس سونے کے تابوت میں دور ایک ایسے مقبرہ کے اندر دفن کیا گیا جو کانسی، ہاتھی دانت اور دیگر اشیا سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن لوہے کا اس کے پاس صرف ایک تعویذ تھا۔ جو اس کی کھوپڑی کے نیچے بندھا ہوا تھا۔ سستے لوہے کی دریافت کے یہ معنی نہیں تھے کہ اس سے لوگوں کی اکثریت کو مسرت حاصل ہوگئی۔ ایشیائے کوچک کی چھوٹی چھوٹی الگ تھلگ قوموں کو کانسہ کے زمانے میں بھی اکثر حملہ آوروں کا سیلاب بہالے گیا تھا جب زیادہ وافر نفری قوت (اکثر زرخرید اور زمین سے وابستہ زرعی غلاموں کی صورت میں) فراہم ہوسکی تو صرف اسی وقت لوہے کے استعمال کے معنی ہوئے زیادہ غذا۔ زیادہ جبر وظلم۔ تجارتی راستوں سے دور کچھ الگ تھلگ رہنے والے قبائلی ایسے رہ گئے (اور تقریباً آج تک موجود ہیں) جو خود کو بدل کر غذا پیدا کرنے کی بجائے غذا تلاش وجمع کرنے کے عہد حجری پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہے۔ وہ تہذیب کی سمت پیش قدمی سے الگ ہوکر رہ گئے پتھر کا گاہ بگاہ استعمال قبل تاریخ کے عہد سے تاریخی دور میں کافی دور تک جاری رہا۔ شاہ ہیر کی فوج کے بہت سے لوگ 1066ء میں ہسٹنگیز کی جنگ کے دوران پتھر کی کلہاڑی سے مرے تھے اگرچہ 54ق.م. میں جولیس سیزر کے حملے سے بہت پہلے ہی انگلستان آہنی عہد میں داخل ہوچکا تھا۔ ایک کل کی حیثیت سے غذا جمع کرنے والے سماج کی خصوصیات بیان کرنا آسان نہیں عہد حاضر کا رومانی مکتب انشا یقین رکھتا تھا کہ ابتدائی قدیم آدمی لازمی طور پر ایک شریف وحشی ہوگا۔ تہذیب کی آلودگیوں سے پاک فطرت کا ایک طفل معصوم۔ برائیوں اور حرص و آز سے آزاد۔ ایک فطری ارضی بہشت کا یہ افسانہ کرسٹوفر کولمبس کے ایک خط سے شروع ہوا جو اس نے کسٹیل کی ملکہ بیلا کے نام لکھا تھا۔ اس سیاح کو جب ہندوستان کے زریں شہروں تک پہنچنے میں ناکامی ہوئی تو وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے مضطرب ہوگیا کہ اس نے بہرحال ایک غیر معمولی چیز دریافت کرلی ہے۔ بعض امریکہ کے جنوبی جزائر کا انسان فطری حالت میں۔ اس طرح ہیجان میں آکر یورپ کی قوت تخیل ایسی چیز مل گئی جو (''باغ عدن'' کے بعد) نہ تو انجیل میں موجود تھی اور نہ ان یونانی لاطینی ادبیت عالیہ کی خیالی جدتوں میں جن کی دریافتِ نو ''نشاط ثانیہ'' میں ہوئی تھی۔ ارسو کے سماجی نظریات اور والٹیئر کی اپنے ہم عصر سماج پر بھرپور طنزیات کو اس ''فطری انسان'' دریافت سے بڑی تقویت ملی کچھ لوگ تو ابتدائی قدیم کمیونزم کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں گویا وہ معاشرے کی ایک معیاری حالت تھی جس میں سب کا حصہ برابر تھا اور سب اپنی سادہ ضرورتیں امدادِ باہمی سے پوری کرتے تھے اسی چیز کو انتہا تک لے جائیں تو یہ بھی عہد حاضر کے سرخی مائل لباس میں ''عہدِ زرّیں'' کا ہی ایک افسانہ ہے۔ غذا اکٹھا کرنے والا ابتداً سماج بڑا محدود تھا۔ ہر مقام پر اور ہر زمانے میں اس کی خصوصی نوعیت کا تعین، غذا کی قلت اور غیر یقینی فراہمی سے ہوتا تھا۔ اگر ہم کلارک جیسا محتاط ماہرِ آثار قدیمہ بالائی قدیم عہد حجری میں انگلینڈ اور ویلز کی مجموعی آبادی کا تخمینہ شاید دو سو پچاس نفوس انسانی بتاتا ہے جو دس چھوٹی جماعتوں میں منقسم تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق ''وسطی عہد حجری'' میں پورے برطانیہ عظمیٰ کی آبادی چار ہزار پانچ سو — ''جدید عہد حجری'' کے کسی ایک دور میں بیس ہزار اور اس کی تعداد کے دُگنے سے کچھ کم ایک ہزار ق.م. اور دو ہزار ق.م. کے درمیان تھی۔ جب کہ'' کانسی کا زمانہ غذائی پیداوار کا سلسلہ کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ ہندوستان میں اثریاتی شہادت فی الحال اس قدر ناقص ہے کہ ہندوستان کے متعلق اس قسم کے تخمینے پیش کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال اگر ہندوستانی تحتی براعظم کے کسی بھی وسیع علاقے میں ''عہد حجری'' کی آبادی ہر

دس مربع میل ایک آدمی سے زیادہ تھی تو یہ بھی ایک حیرت خیز بات ہوگی۔ ان مقامات پر بھی جہاں قدرت مہربان ہے اس کے فیضان تمام موسموں میں یکساں نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی متواتر سال قلت کے آئیں۔ ایک بڑی مجموعی آبادی متعلق قائم شدہ بستیاں کسی قسم کی غذائی ذخیروں کے بغیر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ غذا کو محفوظ رکھنے کی منزل غذا کی تلاش وجمع کی زندگی مقابلتاً بعد میں آتی ہے۔ خشک مچھلی اور گوشت کو محفوظ رکھنے کے لیے نمک کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی قدر فاصلے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح غذا کو رکھنے والی چیزیں مثلاً ٹوکریاں چھننے کے تھیلے اور مٹی کے برتن وغیرہ بھی ضروری ہیں تمام اقسام کی غذا کو محفوظ بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ ذخیرہ کرنے کے لیے مغز والے میوے غلہ اور کچھ پودوں کی جڑیں بہترین چیزیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر پکائے بغیر ہضم نہیں ہوسکتیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آگ پر قدرت حاصل ہو اور کچھ مٹی یا برتن کے دھات موجود ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے سے بہت پہلے آدمی نے سماجی زندگی کے خاص طریقے پیدا کر لیے تھے کیونکہ وہ پہلے ہی ہزاروں سال تک اوزار استعمال کرنے والے حیوان کی حیثیت سے زندگی گزار چکا تھا۔

دو باتیں بدیہی ہیں۔ اگر غذا کو محفوظ نہیں رکھا جاتا تو اسے جلد جلد کھا لینا چاہیے۔ اس کے معنی ہیں فاضل غذا بانٹ لی جائے ورنہ بہت سے انسان بھوکے مرجائیں گے لیکن بہت سے جانوروں کے گروہ بھی اپنی فاضل غذا بانٹ لیتے ہیں۔ قدیم ابتدائی انسانی گروہوں میں جو غذائی قلت کی منزل سے آگے نکل گئے تھے۔ غذا کی باہمی تقسیم انجام کار ایک سماجی فریضہ بن گئی۔ مثلاً خاص موقعوں پر ضیافتیں دینا ضروری ہوگیا اس کے معنی یہ ہیں کہ جمع شدہ تمام غذا میں حصہ پانے کے لیے ہر ایک فرد کو مساوی حق حاصل تھا۔ دوسرے یہ کہ شاذ و نادر ہی اپنے استعمال سے زیادہ غذا جمع کرتے یا شکار کرتے ہیں ان کو یہ حرص ہوتی ہے کہ غذا کے انبار جمع کر لیے جائیں اور نہ یہ شوق ہوتا ہے کہ خالص تفریح کی خاطر جانوروں کا قتل عام کر ڈالیں اور گوشت کو سڑنے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس حد تک عہد زریں کا افسانہ کچھ حقیقت ضرور رکھتا ہے لیکن قدیم ابتدائی انسان کی زیادہ تر قوت غذا کی تلاش میں صرف ہوتی تھی۔ غذا کی باہمی تقسیم کرنے والا سب سے بڑا واحدہ جس کی جسامت ہمیشہ ماحول کے مطابق محدود ہوتی تھی کسی ایک قسم کی غذا مثلاً ایک جانور مچھلی، پرندہ، کیڑا، پھل یا پھلی پر اپنی توجہ مرکوز نہ کرنے کا رجحان رکھتا تھا اس کے معنی ہوتے تھے نہ صرف تخصیص بلکہ ضرورت سے زیادہ تخصیص۔ یہ انسانی واحدہ خود کو نہ صرف ایک قرابتی جماعت ہی نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسی مادہ سے بنا ہوا خیال کرتا تھا جس سے ان کی خاص اور مرغوب غذا پیدا ہوتی تھی۔ دوسرے انسانی گروہ جو کسی اور غذائی شے کی تخصیص کر لیتے تھے قرابت نہیں مانتے تھے اور ابتدا میں تو ان کو انسان بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہم اس خصوصی غذا کو ان کا ''ٹوٹم'' (قبیلہ کا امتیازی فطری نشان) کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ ایک بہت بعد کی منزل میں بے جان چیزوں اور جانوروں کے جسمانی حصوں کو بھی مختلف گروہوں کی علامات (ٹوٹم سمجھا جاسکتا تھا۔ اس علامتی غذا کو جمع کرنے کے طبعی میلان کے ساتھ خاص قسم کی مذہبی رسوم وابستہ تھیں۔ کسی طرح کی قربانی (جس میں انسانی قربانی بھی شامل تھی) اور دوسری رسوم خواہ ان کی ادائگی کتنی ہی کورانہ کیوں نہ ہو دراصل اصل مقصد کے حصول کے لیے ادا کی جاتی تھیں کہ (خصوصی) غذا کی فراہمی میں اضافہ ہو اور اس کو اس نیم طفلی گروہ میں بھی اضافہ ہو جو اسے کھاتا تھا۔ یہ رسمیں ہمارے لیے بہت اہم ہیں کیونکہ ان میں عہد حاضر کی ثقافتی سرگرمیوں کے تخم موجود ہیں۔ رقص جس میں کہ شاید لوگ شکار کے جانور کی نقل پیش کرتے تھے اور کچھ لوگ شکاریوں کی درحقیقت ایک مذہبی رسم بھی تھا اور گھر سے باہر کام کرنے کی ایک مشق بھی۔ گویا شکار کی تکنیک کی ایک تربیت۔ ہزاروں سال کے بعد اسی سے پہلے اور ڈراما پیدا ہونے والے تھے۔ جنگلی جانوروں کی تصویریں جو ''عصر برفانی'' میں حیرت ناک صحت اور مطابقت اصل کے ساتھ بنائی گئی تھیں (فرانس اور اسپین کے غار) وہ اب فن مصوری کے شاہکار شمار کی جاتی ہیں۔ لیکن اصل تصویروں کا خاص مقصد فن نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ تصویر چربی کے دھندلے چراغوں یا مشعلوں کی برد سے بالکل تاریک زیر زمین غاروں میں بنائی گئی تھیں۔ جہاں دن کی روشنی کا گزر بھی نہیں ہوتا تھا۔ کہیں کہیں تصویریں ایک دوسرے پر چڑھ گئی ہیں اور ایک دوسرے کو خراب کر دیا ہے۔ جانوروں کے نہایت نفیس سنگین مجسمے نشانہ بازی کی مشق، مذہبی رسم کے لیے استعمال کیے جاتے تھے جس کا مظہر وہ سوراخ ہیں جو نیزوں اور تیروں سے پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ مجسمے زیر زمین مادر گیتی کے بالکل بطن میں بھی موجود ہیں۔ جفتی ہوتے ہوئے جانوروں کے جوڑے جو غاروں کی دیواروں پر منبت کاری یا سنگ تراشی کے ذریعے بنائے گئے ہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ فن کارانہ اظہار کے لیے ایسے نمونے اس چیز کا ایک حصہ تھے جس کو افزائش نسل کی رسوم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بلاشرکت غیرے اس خاص گروہ کا ایک سربستہ راز ہوتی تھی۔ محدود غذائی فراہمی کے باعث ایک ہی نسل کے حدود جداگانہ فرقے بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کی وسط مغربی چراگاہوں میں گلہریوں کے گروہ اپنے علاقے میں ایک اجنبی گلہری کی موجودگی برداشت نہیں کرتے لیکن خود ہر ایک گروہ کی گلہریاں آپس میں امن سے رہتی ہیں۔ ان کی ایک خاص ''رسم''، ''بوسہ'' ہے جو اپنی گروہ کی گلہری کو شناخت کرنے کا کام دیتا ہے۔ وہ انسانی گروہ بھی جن پر ہم غور کر رہے ہیں لازمی طور پر اسی طرح کے مخصوص مگر بدلے ہوئے علاقے رکھتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے محدود خیالات کو مخصوص مقررہ

تھے۔ اور یوریشیائی براعظم میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ دریائی وادیوں کی قدیم تر زرعی ثقافتیں اس سے ایک ہزار قبل ہی مصر اور میسو پوٹامیہ میں شہری ریاستوں، بادشاہتوں معبدی پیشوائیوں اور جنگ وجدل کے اداروں کو پروان چڑھا چکی تھیں اس طرح کی ترقی ونشوونما مقامی اور استثنائی تھی۔ موجودہ زمانہ عصریاتی اعتبار سے لوہے کا زمانہ ہے لوہا ایک کافی ارزاں اور وسیع طور پر ملنے والی دھات ہے جو زراعت کے لیے ایک عالمی امکان فراہم کرسکتی ہے اواخر عہد حجری میں کچھ زراعت ضرور نمودار ہوئی تھی اس لیے ہم ذرائع پیداوار میں ایک جدید حجری انقلاب'' کا نام لے سکتے ہیں لیکن چند مخصوص پسندیدہ علاقوں ہی تک محدود تھا، جہاں گھنے جنگلوں کو صاف کرنا ضروری نہیں تھا مثلاً میسو پوٹامیہ (عراق) مصر، وادیِ سندھ، ایران کے مرتفع میداں ترکی، فلسطین۔ ولدی ڈینوب کی چکنی مٹی کے تنگ قطعہ کے بعض حصے اور شاید چین میں زرد چکنی مٹی کے بعض علاقے۔ اگرچہ لوہا جب پہلی بار تیار کیا گیا تو کانسی سے نرم تھا پھر بھی اس کے ذریعے جنگل صاف کیے جاسکے اور سخت تر مٹی میں ہل چلانا ممکن ہوسکا۔ یہ پہلی دھات تھی جو بہت سے لوگوں کو دستیاب تھی اور ایک مضبوط جنگ جو طبقے کے اجارہ میں نہیں تھی۔ اولین کسان جنھوں نے کتال ہیوک (ترکی) اور جیریکو (فلسطین) کے مقام پر قصبے تعمیر کیے۔ ان کا زمانہ سات ہزار ق.م. سے آٹھ ہزار ق.م. تک پہنچتا ہے۔ لیکن ان کے غذا پیدا کرنے کے طریقے قریب کے میدان میں وسیع پیمانے پر استعمال نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کی کاشت کاری مصر اور عراق کے برخلاف غذا اندوزی اور گلہ بانی کی محض ایک ضمیمہ اس وقت تک بنی رہی۔ جب تک دو ہزار ق.م. کے اواخر میں لوہا دستیاب نہ ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوہا تیار کرنے کے سب سے پہلے عمدہ طریقے حتیٰ کہ لوگوں کے اجارے میں تھے جس کی وہ سخت حفاظت کرتے تھے۔ یہ لوگ اس علاقے میں آباد تھے جو اب ترکی کہلاتا ہے 1450 ق.م. میں بھی لوہا اتنا کمیاب تھا کہ فرعون، طوطن، خامن ایک ٹھوس سونے کے تابوت میں دور ایک ایسے مقبرہ کے اندر دفن کیا گیا جو کانسی، ہاتھی دانت اور دیگر اشیا سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن لوہے کا اس کے پاس صرف ایک تعویذ تھا۔ جو اس کی کھوپڑی کے نیچے بندھا ہوا تھا۔ سستے لوہے کی دریافت کے یہ معنی نہیں تھے کہ اس سے لوگوں کی اکثریت کو مسرت حاصل ہوگئی۔ ایشیائے کوچک کی چھوٹی چھوٹی الگ تھلگ قوموں کو کانسہ کے زمانے میں بھی اکثر حملہ آوروں کا سیلاب بہالے گیا تھا جب زیادہ وافر نفری قوت (اکثر زرخرید اور زمین سے وابستہ زرعی غلاموں کی صورت میں) فراہم ہوسکی تو صرف اسی وقت لوہے کے استعمال کے معنی ہوئے زیادہ غذا۔ زیادہ جبر وظلم۔ تجارتی راستوں سے دور کچھ الگ تھلگ رہنے والے قبائلی ایسے رہ گئے (اور تقریباً آج تک موجود ہیں) جو خود کو بدل کر غذا پیدا کرنے کی بجائے غذا تلاش وجمع کرنے کے عہد حجری پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہے۔ وہ تہذیب کی سمت پیش قدمی سے الگ ہوکر رہ گئے پتھر کا گاہ بگاہ استعمال قبل تاریخ کے عہد سے تاریخی دور میں کافی دور تک جاری رہا۔ شاہ ہیرلڈ کی فوج کے بہت سے لوگ 1066ء میں ہسٹنگیز کی جنگ کے دوران پتھر کی کلہاڑی سے مرے تھے اگرچہ 54 ق.م. میں جولیس سیزر کے حملے سے بہت پہلے ہی انگلستان آہنی عہد میں داخل ہوچکا تھا۔ ایک کل کی حیثیت سے غذا جمع کرنے والے سماج کی خصوصیات بیان کرنا آسان نہیں عہد حاضر کا رومانی مکتب انشا یقین رکھتا تھا کہ ابتدائی قدیم آدمی لازمی طور پر ایک شریف وحشی ہوگا۔ تہذیب کی آلودگیوں سے پاک فطرت کا ایک طفل معصوم۔ برائیوں اور حرص و آز سے آزاد۔ ایک فطری ارضی بہشت کا یہ افسانہ کرسٹوفر کولمبس کے ایک خط سے شروع ہوا جو اس نے کسٹیل کی ملکہ بیلا کے نام لکھا تھا۔ اس سیاح کو جب ہندوستان کے زریں شہروں تک پہنچنے میں ناکامی ہوئی تو وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے مضطرب ہوگیا کہ اس نے بہرحال ایک غیر معمولی چیز دریافت کرلی ہے۔ بعض امریکہ کے جنوبی جزائر کا انسان فطری حالت میں۔ اس طرح ہیجان میں آکر یورپ کی قوت تخیل ایسی چیز مل گئی جو (''باغ عدن'' کے بعد) نہ تو انجیل میں موجود تھی اور نہ ان یونانی لاطینی ادبیت عالیہ کی خیالی جدتوں میں جن کی دریافتِ نو'' نشاط ثانیہ'' میں ہوئی تھی۔ ارسو کے سماجی نظریات اور والٹیئر کی اپنے ہم عصر سماج پر بھرپور طنزیات کو اس ''فطری انسان'' دریافت سے بڑی تقویت ملی کچھ لوگ تو ابتدائی قدیم کیونزم کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں گویا وہ معاشرے کی ایک معیاری حالت تھی جس میں سب کا حصہ برابر تھا اور سب اپنی سادہ ضرورتیں امدادِ باہمی سے پوری کرتے تھے اسی چیز کو انتہا تک لے جائیں تو یہ بھی عہد حاضر کے سرخی مائل لباس میں ''عہدِ زریں'' کا ہی ایک افسانہ ہے۔
غذا اکٹھا کرنے والا ابتدائی سماج بڑا محدود تھا۔ ہر مقام پر اور ہر زمانے میں اس کی خصوصی نوعیت کا تعین، غذا کی قلت اور غیر یقینی فراہمی سے ہوتا تھا۔ اگر ہم کلارک جیسا محتاط ماہر آثار قدیمہ۔ بالائی قدیم عہد حجری میں انگلینڈ اور ویلز کی مجموعی آبادی کا تخمینہ شاید دو سو پچاس نفوس انسانی بتاتا ہے جو دس چھوٹی جماعتوں میں منقسم تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق ''وسطی عہد حجری'' میں پورے برطانیہ عظمیٰ کی آبادی چار ہزار پانچ سو ــــ ''جدید عہد حجری'' کے کسی ایک دور میں بیس ہزار اور اس کی تعداد کے دُگنے سے کچھ کم ایک ہزار ق.م. اور دو ہزار ق.م. کے درمیان تھی۔ جب کہ'' کانسی کا زمانہ غذائی پیداوار کا سلسلہ کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ ہندوستان میں اثریاتی شہادت فی الحال اس قدر ناقص ہے کہ ہندوستان کے متعلق اس قسم کے تخمینے پیش کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال اگر ہندوستانی تحتی براعظم کے کسی بھی وسیع علاقے میں'' عہد حجری'' کی آبادی ہر

دس مربع میل ایک آدمی سے زیادہ تھی تو یہ بھی ایک حیرت خیز بات ہوگی۔ ان مقامات پر بھی جہاں قدرت مہربان ہے اس کے فیضان تمام موسموں میں یکساں نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی متواتر سال قلت کے آئیں۔ ایک بڑی مجموعی آبادی متعلق قائم شدہ بستیاں کسی قسم کی غذائی ذخیروں کے بغیر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ غذا کو محفوظ رکھنے کی منزل غذا کی تلاش وجمع کی زندگی مقابلتاً بعد میں آتی ہے۔ خشک مچھلی اور گوشت کو محفوظ رکھنے کے لیے نمک کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی قدر فاصلے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح غذا کو رکھنے والی چیزیں مثلاً ٹوکریاں چمڑے کے تھیلے اور مٹی کے برتن وغیرہ بھی ضروری ہیں تمام اقسام کی غذا کو محفوظ بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ ذخیرہ کرنے کے لیے مغز والے میوے غلہ اور کچھ پودوں کی جڑیں بہترین چیزیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر پکائے بغیر ہضم نہیں ہوسکتیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آگ پر قدرت حاصل ہو اور کچھ مٹی یا برتن کے دھات موجود ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے سے بہت پہلے آدمی نے سماجی زندگی کے خاص طریقے پیدا کر لیے تھے کیونکہ وہ پہلے ہی ہزاروں سال تک اوزار استعمال کرنے والے حیوان کی حیثیت سے زندگی گزار چکا تھا۔

دو باتیں بدیہی ہیں۔ اگر غذا کو محفوظ نہیں رکھا جاتا تو اسے جلد جلد کھالینا چاہیے۔ اس کے معنی ہیں فاضل غذا بانٹ لی جائے ورنہ بہت سے انسان بھوکے مرجائیں گے لیکن بہت سے جانوروں کے گروہ بھی اپنی فاضل غذا بانٹ لیتے ہیں۔ قدیم ابتدائی انسانی گروہوں میں جو غذائی قلت کی منزل سے آگے نکل گئے تھے۔ غذا کی باہمی تقسیم انجام کار ایک سماجی فریضہ بن گئی۔ مثلاً خاص موقعوں پر ضیافتیں دینا ضروری ہوگیا اس کے معنی یہ ہیں کہ جمع شدہ تمام غذا میں حصہ پانے کے لیے ہر ایک فرد کو مساوی حق حاصل تھا۔ دوسرے یہ کہ شاذ و نادر ہی اپنے استعمال سے زیادہ غذا جمع کرتے یا شکار کرتے ہیں ان کو یہ حرص ہوتی ہے کہ غذا کے انبار جمع کر لیے جائیں اور نہ یہ شوق ہوتا ہے کہ خالص تفریح کی خاطر جانوروں کا قتلِ عام کر ڈالیں اور گوشت کو سڑنے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس حد تک عہدِ زرّیں کا افسانہ کچھ حقیقت ضرور رکھتا ہے لیکن قدیم ابتدائی انسان کی زیادہ تر قوت غذا کی تلاش میں صرف ہوتی تھی۔ غذا کی باہمی تقسیم کرنے والا سب سے بڑا واحدہ جس کی جسامت ہمیشہ ماحول کے مطابق محدود ہوتی تھی کسی ایک قسم کی غذا مثلاً ایک جانور مچھلی، پرندہ، کیڑا، پھل یا بصلہ پر اپنی توجہ مرکوز نہ کرنے کا رجحان رکھتا تھا اس کے معنی ہوتے تھے نہ صرف تخصیص بلکہ ضرورت سے زیادہ تخصیص۔ یہ انسانی واحدہ خود کو نہ صرف ایک قرابتی جماعت ہی نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسی مادہ سے بنا ہوا خیال کرتا تھا جس سے ان کی خاص اور مرغوب غذا پیدا ہوتی تھی۔ دوسرے انسانی گروہ جو کسی اور غذائی شے کی تخصیص کر لیتے تھے قرابت نہیں مانتے تھے اور ابتدا میں تو ان کو انسان بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہم اس خصوصی غذا کو ان کا ''ٹوٹم'' (قبیلہ کا امتیازی فطری نشان) کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ ایک بہت بعد کی منزل میں بے جان چیلوں اور جانوروں کے جسمانی حصّوں کو بھی مختلف گروہوں کی علامات (ٹوٹم سمجھا جاسکتا تھا۔ اس علامتی غذا کو جمع کرنے کے طبعی میلان کے ساتھ خاص قسم کی مذہبی رسوم وابستہ تھیں۔ کسی طرح کی قربانی (جس میں انسانی قربانی بھی شامل تھی) اور دوسری رسوم خواہ ان کی ادائیگی کتنی ہی کورانہ کیوں نہ ہو دراصل اصل مقصد کے حصول کے لیے ادا کی جاتی تھیں کہ (خصوصی) غذا کی فراہمی میں اضافہ ہو اور اس کو اس نیم طفلی گروہ میں بھی اضافہ ہو جو اسے کھاتا تھا۔ یہ رسمیں ہمارے لیے بہت اہم ہیں کیونکہ ان میں عہدِ حاضر کی ثقافتی سرگرمیوں کے تخم موجود ہیں۔ رقص جس میں کہ شاید لوگ شکار کے جانور کی نقل پیش کرتے تھے اور کچھ لوگ شکاریوں کی درحقیقت ایک مذہبی رسم بھی تھا اور گھر سے باہر کام کرنے کی ایک مشق بھی۔ گویا شکار کی تکنیک کی ایک تربیت۔ ہزاروں سال کے بعد اسی سے پہلے اور ڈراما پیدا ہونے والے تھے۔ جنگلی جانوروں کی تصویریں جو ''عصرِ برفانی'' میں حیرت ناک صحت اور مطابقتِ اصل کے ساتھ بنائی گئی تھیں (فرانس اور اسپین کے غار) وہ اب فنِ مصوّری کے شاہکار شمار کی جاتی ہیں۔ لیکن اصل تصویروں کا خاص مقصد فن نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ تصویر چربی کے دھندلے چراغوں یا مشعلوں کی برد سے بالکل تاریک زیرِ زمین غاروں میں بنائی گئی تھیں۔ جہاں دن کی روشنی کا گزر بھی نہیں ہوتا تھا۔ کہیں کہیں تصویریں ایک دوسرے پر چڑھ گئی ہیں اور ایک دوسرے کو خراب کر دیا ہے۔ جانوروں کے نہایت نفیس سنگین مجسمے نشانہ بازی کی مشق، مذہبی رسم کے لیے استعمال کیے جاتے تھے جس کا مظہر وہ سوراخ ہیں جو نیزوں اور تیروں سے پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ مجسمے زیرِ زمین مادرگیتی کے بالکل بطن میں بھی موجود ہیں۔ جفتی ہوتے ہوئے جانوروں کے جوڑے جو غاروں کی دیواروں پر منبت کاری یا سنگ تراشی کے ذریعے بنائے گئے ہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ فن کارانہ اظہار کے لیے ایسے نمونے اس چیز کا ایک حصہ تھے جس کو افزائش نسل کی رسوم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بلاشرکت غیرے اس خاص گروہ کا ایک سربستہ راز ہوتی تھی۔ محدود غذائی فراہمی کے باعث ایک ہی نسل کے حدود جداگانہ فرقے بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کی وسط مغربی چراگاہوں میں گلہریوں کے گروہ اپنے علاقے میں ایک اجنبی گلہری کی موجودگی برداشت نہیں کرتے لیکن خود ہر ایک گروہ کی گلہریاں آپس میں امن سے رہتی ہیں۔ ان کی ایک خاص ''رسم''، ''بوسہ'' ہے جو اپنی گروہ کی گلہری کو شناخت کرنے کا کام دیتا ہے۔ وہ انسانی گروہ بھی جن پر ہم غور کر رہے ہیں لازمی طور پر اسی طرح کے مخصوص مگر بدلے ہوئے علاقے رکھتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے محدود خیالات کو مخصوص مقررہ

آوازوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتا ہوگا۔ قدیم ابتدائی زندگی کے متعلق جتنا کچھ مواد آج کل ہم جمع کر سکتے ہیں اس کی روشنی میں یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ آواز موجودہ لسانی اقسام میں سے کس کے ذیل میں آتی ہیں۔ چونکہ بنیادی اسباب وعلل جن کو بعد میں سائنسی تجزیہ نے دریافت کیا ابھی تک پوشیدہ تھے اس لیے قدیم ابتدائی آدمی تسلیم شدہ رسم ورواج سے انحراف کا حوصلہ نہ کرسکا۔

مختلف گروہوں کو قریب تر لانے والا بڑا قدم درحقیقت روابط پیداوار اور مبادلے میں مضمر تھا۔ ابتدائی قدیم معاشرے کے ابتدائی مرحلوں میں آزاد جنس بہ جنس مبادلے کا وہ طریقہ نہیں پایا جاتا جیسا کہ (مثال کے طور پر) انیسویں بیسویں صدی کے موڑ پر جزائر ٹروبیر یانڈ میں پایا جاتا تھا۔ باہمی غذائی تقسیم کے رشتے میں منسلک ایک گروہ کے باہر مبادلہ تحائف کے تبادلے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں یہ تحفہ ہر کس وناکس کو نہیں دیا جاتا بلکہ صرف ان افراد کو جن سے خاص معینہ رشتہ ہو جو اکثر ''تجارتی دوست'' کہے جاتے ہیں۔ تحفہ نہ تو مانگا جاسکتا ہے نہ اس کو لینے سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ مساوی تحفے کے متعلق مول تول کے ذریعے اس کی قیمت ادا کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس قسم کا تحفہ انسان کو اس امر پر مجبور ضرور کرتا ہے کہ اس کو قبول کرنے کے بعد کسی بھی مناسب موقع پر جب اس کے پاس کچھ فاضل چیزیں ہوں وہ اپنی ذاتی کوئی شے بطور چندہ دے دے۔ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں رکھا جاتا لیکن ایک خاص مدت میں حساب کا برابر کرنے کا احساس عموماً رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص آخر کار بدلے میں ایسی چیزیں نہیں دیتا جس کو طرفین اپنے دل میں مساوی قیمت کی تسلیم کرتے ہیں تو ایسا شخص کسی نہ کسی شکل میں اپنے سماجی مرتبے کو کھو دیتا ہے۔ تحقیق حالات کے تسلیم شدہ نتائج کے مطابق ایک ہی خصوصی نشان (ٹوٹم رکھنے والی جماعتوں کے درمیان اولین مبادلوں نے آگے بڑھ کر افراد کے مبادلے کا طریقہ بھی رائج کردیا یعنی ایک طرح کا رشتہ ''شادی'' وجود میں آگیا۔ اسی سے یہ بھی نتیجہ ہوا کہ ایک بہتر خوراک۔ غذا کا ایک وسیع تر سلسلہ اور اوزار سازی یا اوزار کاری اور مٹی کے برتن بنانے کے ترقی یافتہ طریقے ممکن ہوسکے۔ آخر ان متحدہ گروہوں کی زبان میں بھی معتدبہ اضافہ ہوگیا۔ تمام معروف قدیم وابتدائی زبانیں ایک غیر ضروری حد تک پیچیدہ صرف ونحو رکھتی ہیں۔ اس خصوصیت میں سنسکرت یونانی اور فنلی (فن لینڈ کی) زبان بھی شریک ہے۔ ان میں عام تصورات کم ہیں اور خصوصی اصطلاحات زیادہ۔ ''جانور''۔ ''درخت'' وغیرہ عام مقلوں کی حیثیت سے غائب ہیں لیکن جانور اور درخت کی ہر ایک خاص نوع اور اقسام کے لیے ایک لفظ موجود ہے۔ لفظ ''رنگ'' جیسا کہ سمجھا جاتا ہے اشتقاق کے لحاظ سے سرخ کے معنی رکھتا ہے یعنی خون کا رنگ۔ اس طرح زبان خود خیالات کے اظہار و تبادلے سے ترقی پذیر ہوتی ہے۔ تب انسان نہ صرف غذا پر اختیار پانے اور اس کو پیدا کرنے کی منزل کی سمت گامزن ہوجاتا ہے بلکہ ایک ایسا جانور بھی بننا شروع ہوجاتا ہے جو سوچنا جانتا ہے۔ شادی کی قسم کے مبادلے سے توالد وتناسل سے متعلق فائدہ ہوتا ہے۔ چھوٹے انسانی گروہ اکثر قریبی رشتے داروں کی نسل بن جاتے ہیں جس سے ان میں جسمانی بالیدگی رک جاتی ہے اور ذہنی پس ماندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ مختلف خاندانوں وغیرہ کے درمیان باہمی شادی (اختلاط نسل اولاد کی طاقت میں اس سطح تک اضافہ کردیتی ہے جو والدین کی طاقت سے بھی اونچی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یورپ میں ''عصر برفانی'' کے اواخر میں شاندارتن وتوش کے کرماتیو انسان کا ناگہانی ظہور ایسے ہی مختلف النسل والدین کے اختلاط کا نتیجہ ہو جو خود قریبی رشتے داروں کی پس ماندہ وانحطاط زدہ اولاد تھے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انسانی بالیدگی وترقی کی موجودہ منزل میں نسل ایک جائز وصحیح تصور نہیں ہے۔ عام بول چال میں لفظ ''نسل'' کا استعمال کسی بھی منزل پر شاذ ونادر ہی جائز درست ہوتا ہے۔ موجودہ محفوظ رہ جانے والی نسلیں بعد میں ان بڑی بڑی آبادیوں سے پیدا ہوئیں جو مخلوط ومشترک گروہوں کے یکجائی ذخیروں سے وجود میں آئی تھیں۔ بطور نتیجہ زبان کی ترقی تیز تر ہوئی۔

حاصل شدہ فائدہ کسی آزمائش وتجربہ۔ منصوبہ بندی یا مدلل عمل کا نتیجہ نہیں تھے۔ وہ گروہ جنھوں نے لبادے کے نئے منصوبے کو اختیار کیا، تعداد اور کارکردگی میں بڑھ گئے۔ باقی منزل فنا کی طرف دھکیل دیے گئے اولین اقدام جس کو ایک منطقی تقلیب کہا جاسکتا ہے ہر ایک گروہ کے لیے اس کی خصوصی غذا (ٹوٹم) کو ممنوع قرار دینا تھا۔ یہ ممانعت خصوصی موسمی تقریبات پر یا مردہ پرستی کی رسوم کے سلسلے میں ٹوٹتی تھی۔ خصوصی غذا کی ممانعت کے ساتھ ساتھ خصوصی علامت (ٹوٹم) والے ایک ہی قبیلے کے افراد میں جنسی اختلاط بھی ممنون قرار پایا۔ خصوصی علامات والے کئی جرگوں سے مل کر قبیلے بن گئے۔ ایک جرگے کے کسی رکن کو عام حالات میں اس جرگے کی خاص غذا کھانے اور اس جرگے کو کسی فرد سے جنسی اختلاط کی اجازت نہیں تھی اور نہ وہ قبیلے سے باہر شادی کرسکتا تھا اکثر وہ اپنے قبیلے سے باہر کے افراد کا کھانا بھی کھا سکتا تھا۔ جرگے کے افراد اپنی مخصوص مذہبی رسوم رکھتے تھے جن سے دوسرے تمام جرگے خارج سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح پورے قبیلے کی مشترکہ مذہبی رسوم بھی ہوتی تھیں اور مشترکہ بیان بھی ایک چھوٹے سے جرگے سے آگے بڑھ کر پورے قبیلے کی اس تنظیم نے ایک ایسا نمونہ پیش کیا جو بیشتر انسانی معاشروں پر مہر ثبت کرگیا ہے۔

□□□

پی.سی. گپتا

(ہماری مطبوعات سے)

1857 اور ہندی ادب

1857 ہندوستانی عوام کے حافظے میں ایک یادگار سال ہے جس میں برطانوی حکومت کو ایک حقیقی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے اقتدار کو تخت دھکا لگا۔ بعد میں اس کی یاد نے قومی آزادی کی متعدد تحریکوں میں جوش پیدا کیا۔ خاص طور پر آنے والے برسوں میں مسلح بغاوت کی تمام کوششوں کو 1857 کی روایت سے قابل قدر اخلاقی تقویت ملی۔ بغاوت کے سرکردہ راہنماؤں کو بالخصوص رانی لکشمی بائی اور کنور سنگھ کو ہندوستانیوں کے دلوں میں بحیثیت قومی سورماؤں کے عزت کا مقام حاصل ہے۔ بہت سی نظموں، لوک گیتوں اور دوسری ادبی تخلیقات میں ان کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

ہندی ادب میں بغاوت کے سیدھے حوالے بہت کم ہیں لیکن اقتصادی لوٹ کھسوٹ کی طرف اشاروں کی کثرت ہے۔ ہمیں اپنے شاعروں اور نثرنگاروں کے ادب پاروں سے ذلّت اور دردوکرب کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔ تمام جدید ہندی ادب میں ردیفِ شعر کی طرح اس غم کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ اغیار نے نہ صرف اس عظیم ملک کو تباہ و برباد کیا بلکہ اس کی عزت کو بھی خاک میں ملایا۔

مغلیہ حکومت کے آخری دور میں ہندی شاعری میں عشقیہ مضامین اور رسمی اسالیب شاعری کا غلبہ تھا۔ ملک پر برطانوی قبضے کے بعد یہ شاعری سماجی شعور حاصل کرنے لگی۔ اس دور کے شاعر پنڈت یکیہ دت تواڑی اس بات پر اظہار تاسف کرتے ہیں کہ ملک عیش وعشرت کا دلدادہ ہے:

''ہندوستانی عیش وعشرت میں مستغرق ہیں اور انھوں نے اس کے آلام وآفات سے آنکھیں موند رکھی ہیں۔ وکرماجیت کی بہادری کہاں ہے؟ راجہ بھوج کا نام ونشان نہیں رہا۔ پایہ تخت کی ساری آبادی عیاشی میں محو ہے۔ قنوج کی آب وتاب کہاں ہے؟''(1)

ایک اور شاعر مکرند لچھمن اسی قسم کے جذبات کو ظاہر کرتا ہے:

''ہندوستان غمزدہ ہے، ہزاروں سال اس نے سختی جھیلی ہے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ان مصائب پر کیسے قابو پائیں۔ وہ لاپرواہیں اور سوچتے ہیں کہ اس پر کیوں وقت ضائع کریں۔ جو ہو، سو ہو، ہم رادھا اور کدم کے تصور میں محو ہیں۔''
(2)

مشہور ہندی ناول نگار ورنداون لال ورما کے پاس ہردیش کی ایک نظم ہے جو جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا ہمعصر تھا۔ ہردیش بھی اخلاقی قدروں کے المناک زوال پر تاسف کا اظہار کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

''اس کلجگ میں کتنے امیر کبیر خاک میں مل گئے
لیکن اوباش گردن میں موتیوں کے ہار پہنے پھرتے ہیں
بقول ہردیش علما ہرن کی کھال اوڑھتے ہیں
لیکن مطرب اور رقاص قیمتی شال زیب تن کرتے ہیں۔''(3)

گنگا پرساد اور چتریش کی ناتمام نظمیں اور شاعر بھگی داؤجی شیام کی راسو کا ایک مسخ شدہ نسخہ جھانسی کے مشہور انقلاب پسند راہنما شری بھگوان سنگھ ماہور کے پاس ہے جو بھساول مقدمہ سازش میں ماخوذ تھے۔ رانی جھانسی سے متعلق بندیلکھنڈ کے مشہور شاعر کلیان کی ایک نظم ہے۔ اس کے جو حصے دستیاب تھے وہ حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں بعض ایسے نادر اشعار ہیں جو زور بیان اور حسن خیال کے مرقعے ہیں۔ ان سے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد، شجاعت، جوانمردی اور ایثار نفس کی روایات اور حفاظت کی تکمیل ہوتی ہے۔

ممتاز شعرا اور ادبا کی تصنیفات میں اقتصادی خستہ حالی، مفلسی اور لوٹ کھسوٹ کے شعور کا متواتر اظہار پایا جاتا ہے۔

بھارتیندو اپنے مشہور ناٹک ''بھارت دُردشا'' میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مصائب حد درجہ جگرخراش ہیں!
خوف سے لوگوں کی آنکھوں تلے اندھیرا ہے وہ مفلس اور کنگال ہیں
برطانوی حکومت کے تحت ہر قسم کی راحت اور نعمت میسر ہے
لیکن ملک کی دولت کو لوٹ کر باہر لے جایا جارہا ہے
مہنگائی، بیماری اور موت نے ناک میں دم کر رکھا ہے
رنج والم روز بروز بڑھ رہے ہیں
اس پر ٹیکس اور بھی غضب ڈھا رہے ہیں
آہ! مصائب نے ہندوستان کو پست کر رکھا ہے۔''(4)

اسی طرح پرتاپ نرائن مشر اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ ملک کی تمام دولت کو انگریز لوٹ کر لے جارہے ہیں:

''اِنقلاب اَٹھارہ سو سَتّاونْ'' سے ماخوذ، مصنف: پی.سی. جوشی، صفحات 259، قیمت: -/75

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

''انگریز ہم سے ہر چیز چھین لیتے ہیں
ہم صرف باتیں کرنا جانتے ہیں
عمل کے بغیر باتیں بے سود ہیں
ہم جادوٹونوں سے مصیبت کو نہیں ٹال سکتے۔''(5)

بھارتیندو اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح تجارت اور دستکاری کی تباہی سے ملک کو مفلس کر دیا گیا ہے:

''وہ ہمیں مشینوں کے ذریعے لوٹ رہے ہیں
دولت دن بدن کم ہو رہی ہے جب کہ آلام ومصائب بڑھ رہے ہیں
باریک سوتی کپڑے اور نفیس ململ کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا
ہم غیر ملکی جولاہوں کے غلام ہیں
ہر چھوٹی موٹی چیز باہر سے درآمد کی جاتی ہے
ہر روز یہاں بھرے ہوئے جہاز آ کر مال اتارتے ہیں۔''(6)

اس دور کے ادب میں یکے بعد دیگرے آنے والے قحطوں کا بار بار ذکر کیا گیا ہے بدری نرائن چودھری پریم گھن لکھتا ہے:

''بھاگو لوگو! بھاگو! خوفناک قحط پڑ گیا ہے
ہندوستان پر تباہی کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
بیوپار اور تجارت کا خاتمہ ہو گیا ہے
صنعت وحرفت کا نام نہیں باقی ہے
زراعت بالکل برباد ہو چکی ہے
چاروں طرف مہنگائی کی آگ بھڑک رہی ہے۔''(7)

1857 کی بغاوت کا براہ راست حوالہ دیتے ہوئے بھارتیندو اس دہشت کا ذکر کرتا ہے جو بغاوت کے بعد لوگوں پر طاری ہوئی:

''فوجی بغاوت کی آگ کو بیدردی کے ساتھ فرو کیا گیا
دہشت کے مارے ہندوستانی دم نہ مار سکتے تھے۔''(8)

پرتاپ نرائن مشر اور بدری نرائن چودھری پریم گھن نے بھی اپنی نظموں میں بغاوت کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ان کا خیال ہے بغاوت غیر مطمئن لوگوں کا کام تھا۔ پرتاپ نارائن مشر لکھتا ہے:

''جب 1857 میں فوج کے ایک حصے نے بغاوت کی تو لوگوں نے ثابت قدمی کے ساتھ حکمرانوں کا ساتھ دیا۔''

پریم گھن بھی اسی انداز میں لکھتا ہے:

''اہلِ مشرق خوفزدہ تھے لوگوں پر ہیبت طاری تھی
جن لوگوں نے خیال کیا کہ مذہب اور ذات خطرے میں پڑ گئے ہیں
انھوں نے چند جاہل فوجیوں اور شہدوں کو اپنے ساتھ ملایا
انھوں نے بڑی تباہی مچائی اور اپنی بربادی کے بیج بوئے۔''(9)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت سے شاعر جاگیرداروں کے سایۂ عاطفت میں رہتے تھے اس لیے وہ ان کے زیر اثر تھے۔ قدرتی طور پر بغاوت کے تئیں ان کا رویہ وہی تھا جو ان کے سرپرستوں کا تھا۔ چنانچہ سیوک ''واگ ولاس'' میں انگریزوں کے تئیں اپنے مربیوں کی ان خدمات کے لیے مدح سرائی کرتا ہے جو انھوں نے بغاوت کے دوران انجام دیں:

''تمام اوصاف سے آراستہ، انعام واکرام عطا کرنے والا،
انگریزوں کا وفادار، حسین اور خوبرو،
اس نے بغاوت کے دوران حکمرانوں کی بے حد مدد کی۔''(10)

ایک اور شاعر 'رس راج' بہاری سنگھ البتہ کمپنی کی حکومت کے تحت لوگوں پر ڈھائے گئے جور وستم کا ذکر کرتا ہے جس نے بالآخر ان کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا اور انھیں بغاوت پر آمادہ کیا: ''ساری دنیا جانتی ہے کہ 1857 کے ہنگامے کے دوران کس قدر مظالم ڈھائے گئے۔ لوگ دہشت زدہ تھے۔''(11)

جب ہم کم مشہور یا گم نام شعرا کے کلام کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ان باغیوں کو زیادہ فیاضانہ خراج تحسین ادا کیا جنھوں نے غیر ملکی حکومت اور اس سے وابستہ بے غیرت تاخت وتاراج کے خلاف بغاوت کی تھی۔ لوک گیتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور کنور سنگھ جیسے بلند پایہ باغی راہنماؤں کی عظمت اور عزت کے راگ الاپے گئے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عوام ملک کی اس بربادی اور راس کے استحصال کو، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاصہ تھا، نفرت اور خصومت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان گمنام شاعروں نے بغاوت کے ان راہنماؤں کو دیوتا کا درجہ دے کر عقیدت کے پھول چڑھائے کیوں کہ ان سورماؤں نے حیرت انگیز دلیری اور بہادری کے ساتھ ایک ایسے دشمن کا مقابلہ کیا جو مسلح قوت اور تنظیم کے اعتبار سے برتر تھا۔

1857 کی بغاوت کی اس روایت کی لوگوں نے پورے سو سال پرورش کی جو شجاعت ایثار نفس اور ناقابلِ تسخیر حبِ وطن کی روایت تھی۔ بعد کی مسلح بغاوتوں کے لیے یہ فیضان کا سرچشمہ رہی۔ مثلاً چٹاگانگ کی بغاوت اور حال کی بحری فوج کی بغاوت جو ہندوستان سے انگریزوں کے جلد رخصت ہونے کا سبب بنی۔ ادیب اور شعرا نے خدمتِ خلق کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے اور رفاہ عامہ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں اس روایت کو برقرار رکھا یہ روایت بھارتیندو کے زمانے کے دویدی یگ کے اور چھایا واد کے شعرا اور ادیبوں کی تصنیفات وتالیفات کے دم سے زندہ ہے۔ یہ روایت منشی پریم چند کی تصنیفات میں بھی محفوظ ہے اور ان ترقی پسندوں اور نئی نسل کے ادیبوں کی تصنیفوں میں بھی جو روز بروز زور پکڑ رہے ہیں۔ ایسی تصنیفات جیسے بھارت بھارتی، ماکھن لال چترویدی سبھدرا کماری چوہان اور نوین کی قومی شاعری میں پرساد، نرالا اور پنت کے کلام میں، پریم چند، راہل، یش پال، رانگے راگھو،

ناگ ارجن اور رینو کے ناولوں میں۔ رانی جھانسی سے متعلق سبھدرا کماری چوہان اور ورنداون لال ورما کی معرکتہ الآرا تصانیف اور نریندر، کیدار، سمن اور آج کے متعدد عوامی شعرا کی شاعری میں ہم کو 1857 کی گونج سنائی دیتی ہے۔

جدید ہندی ادیب متواتر اپنی تصنیفات میں ہندوستان کی قومی توہین کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر چہ شری میتھلی شرن گپت کی ''بھارت بھارتی'' کی طرز غیر معمولی طور پر شائستہ نہیں ہے لیکن اس میں ایسے اشعار موجود ہیں جن سے ہر محب وطن کا دل متاثر ہوتا ہے۔ ایام بغاوت کے شعرا کی طرح شری میتھلی شرن گپت بھی ملک میں افلاس اور قحط کے پھیلنے پر دردو کرب کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں دولت تھی، ہر چیز کی افراط تھی زندگی با مقصد تھی
ساری دنیا میں ہندوستان'' سونے کی چڑیا'' کے نام سے مشہور تھا
اب وہاں مفلسی کا خوفناک ننگا ناچ ہے
اب چاکری کے سوا کوئی کام نہیں جس سے روزی کمائی جائے
جدھر بھی نظر ڈالو مغموم چہرے دکھائی دیتے ہیں
ہر طرف مایوسی کی کالی رات چھائی ہوئی ہے
غم کے شعلے اٹھ اٹھ کر ہمیں جھلس رہے ہیں
نت نئی مصیبت یہاں نازل ہوتی ہے۔''(12)

سمترا نندن پنت اپنی شہرۂ آفاق نظم ''پریورتن'' میں اسی قسم کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں:

''آج بہار غمناک آہیں بھرتی ہیں
گویا سردی کا موسم ہے
موسم بہار میں پھولوں سے لدی ہوئی
ٹہنی جھکی ہوئی تھی
آج یہ بیچارگی کے عالم میں چلا کر کہتی ہے
''جوانی ایک خوفناک وبال ہے۔''(13)

پنت اپنی نظم ''بھارت ماتا'' میں افلاس زدہ ہندوستان کی ایک جگر خراش تصویر کھینچتے ہیں:

''بھارت ماتا کا نواس دیہات میں ہے
اس کا میلا کچیلا دوپٹہ کھیتوں میں بچھا ہے
گنگا جمنا کی نہریں اس کے آنسو ہیں
یہ ایک چکنی مٹی کا بُت ہے
اداس اور غمناک!''(14)

بغاوت کی دردناک یاد ہندوستانیوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے۔ اس سے غیر ملکی حکومت کے لیے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے اور حب وطن کا جذبہ بھڑکتا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہتھیار اٹھائے جیسے بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور سوریہ سین، اور وہ لوگ جو غیر ملکیوں کو وطن سے نکالنے کے لیے مزاحمت عامّہ میں اعتقاد رکھتے تھے ان کے دلوں میں یکساں طور پر 1857 کی بغاوت کے سورماؤں کے تئیں محبت اور تحسین کے جذبات موجزن تھے۔ غیر ملکی حکومت کی مخالفت اور مزاحمت کی یہ روایت ہندی ادب میں بیش بہا ترکہ ہے۔ زیریں رو کی طرح یہ روایت تمام چھایا واد شاعری میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ پریم چند کی انتہا پسندانہ تصنیفات میں یہ نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ یہ ایسے ناولوں کی تصنیف کا موجب ہوئی جیسے ''دادا کامریڈ'' اور ''دیش دروہی'' مصنفہ یش پال ''بلچنما'' اور ''ورن کے بیٹے'' مصنفہ ناگ ارجن اور ''میلا آنچل'' مصنفہ رینو۔ اس نے راہل سانکرتیائن، بھگوت شرن اپادھیائے اور رانگے راگھو کو عالمانہ تصنیفات پر آمادہ کیا۔ ہم اس کی صدائے بازگشت ایسی نظموں میں سنتے ہیں جیسے نریندر کی ''لال نشان''، سمن کی ''نئی آگ ہے''، کیدار کی ''یگ کی گنگا'' اور راجیو سکسینہ کی ''ناوک ودروہ'' بعض افسانوں مثلاً ''تین غنڈے'' مصنفہ کرشن چندر یا اس کے خاکے ''صبح ہوتی ہے'' کے پڑھنے سے قومی جنگ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

جوں جوں لوگوں کا شعور بلند تر سیاسی سطح پر پہنچے گا، گیت اور افسانوں میں اس عظیم قومی واقعہ کی یاد منانے کے لیے بہت سے شاعر اور ادیب 1857 کی بغاوت سے متاثر ہوں گے۔ نئے قومی شعور کے زیر اثر ایسی کوششیں پہلے ہی ہو چکی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب ''مغلوں کے انتم دن'' میں کنگال مغل شہزادوں کی المناک اور رقت انگیز تصویریں کھینچی ہیں۔ بغاوت کے راہنماؤں میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی ذات کے تئیں حد درجہ محبت اور تعظیم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک نظم میں جو لوک گیت کی عام خصوصیات کی حامل ہے، سبھدرا کماری چوہان نے اس والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ جو اس نامور خاتون کے لیے عوام میں پیدا ہوئی۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''راجاؤں کی نسل نے بغاوت کر دی۔ تخت لرزنے لگے
بوڑھے ہندوستان پر پھر سے جوانی کا جوبن آگیا
لوگوں کو از سر نو کھوئی ہوئی آزادی کی قدر کا احساس ہوا
ہر کوئی فرنگی کو نکالنے پر تلا ہوا تھا
1857 میں پرانی تلوار پھر چمک اٹھی
یہ کہانی ہم نے بندھیلوں سے سنی ہے
جو بھگوان شو کی پوجا کرتے ہیں
جھانسی کی رانی نے بہادری اور جوانمردی
کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا۔''(15)

ہندی بولنے والے لوگوں میں اس نظم کی بے حد مقبولیت کا سبب یہ ہے

کہ یہ عوام کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ان جذبات کو جو بغاوت نے برانگیختہ کیے سبھدرا کماری چوہان نے بڑی صراحت کے ساتھ ترجیع بندوں میں بیان کیے ہیں:

'' جھونپڑیوں میں بدبختی کا ڈیرہ تھا، محلات میں فخر خاک میں مل چکا تھا
بہادر سپاہیوں کے دلوں میں گذشتہ شان کا غرور ابھر آیا
نانا جنگ کے لیے تمام سامان فراہم کر رہا تھا
اس کی بہن لکشمی بائی برملا جنگ کی دیوی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی
یکبہ کی اگنی جلائی گئی
انھیں ازسرِ نو گذشتہ کو حاصل کرنا تھا
یہی کہانی ہے جو ہم نے بندھیلوں سے سنی ہے
جو بھگوان شو کی پوجا کرتے ہیں
محل سے چنگاری نمودار ہوئی، جھونپڑیوں میں آگ بھڑک اٹھی
یہ آزادی کا شعلہ تھا جو تمام دلوں میں چھپا ہوا تھا
یہ آگ جھانسی، دہلی اور لکھنؤ تک پھیل گئی
میرٹھ، کانپور اور پٹنہ سب میں آگ لگی ہوئی تھی۔''(16)

پرنسپل منورنجن پرساد نے اسی قسم کی ایک نظم بابو کنور سنگھ پر ''یوک'' 1929 میں لکھی جب یہ پٹنہ سے شری بنی پوری کے زیرادارت شائع ہورہا تھا۔ برطانوی سرکار نے فوراً اس کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ یہ نظم اور رانی جھانسی پر دوسری نظم جو منورنجن بابو نے لکھیں اپنی قوتِ تاثیر اور جوش کی وجہ سے مقبولِ عام ہیں۔ کنور سنگھ سے متعلق نظم یوں شروع ہوتی ہے

'' ترانۂ مسرت بلند ہوا، یہ ترانۂ آزادی تھا
ملک کے ہر گوشے میں یہی ایک ترانہ سنا گیا
ایک سرے پر لکشمی بائی اور پیشوا نانا تھے
دوسرے سرے پر بہار کا بہادر کنور سنگھ تھا
اس اسّی سالہ بوڑھے کی ہڈیوں میں سلگتی آگ بھڑک اٹھی
ہر ایک کی زبان پر ہے: ''کنور سنگھ بڑا سورما تھا۔'' (17)

ہندی کے ممتاز ناول نگار شری ورنداون لال ورما نے ایک ناول بعنوان ''جھانسی کی رانی لکشمی بائی'' لکھا ہے۔ اس ناول کے دیباچے میں وہ بیان کرتا ہے کہ رانی جھانسی نے بانپور کے راجہ مردان سنگھ کے نام ایک خط میں لفظ ''سوراج'' کا استعمال کیا اور اس سے انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مدد مانگی۔ ناول مذکور رانی لکشمی بائی کی بلند نظری اور اس محبت اور تعظیم کا پُرجوش بیان ہے جو لوگ اس کے تئیں رکھتے تھے۔ اس نے جھانسی کی عورتوں کو نجات دلائی اور انھیں مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑنے پر آمادہ کیا۔ ناول میں اسے نانا صاحب سے یوں خطاب کرتے ظاہر کیا گیا ہے:

'' عوام ہی اصل قوت کا ماخذ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قوت بے انتہا ہے۔ چھترپتی نے امرا کی قوت کے سہارے نہیں بلکہ عوام کے ہی بل بوتے پر دہلی کے طاقتور شہنشاہ کو للکارا۔ ماولے اور کنبھی کسان تھے اور اب بھی ہیں۔ ان کے بل ان کی آزادی اور خود مختاری کی مجسم تمنا ہیں۔ میں یہاں کے لوگوں کو بھی ویسا ہی سمجھتی ہوں۔''

شری ورنداون لال ورما، رانی کی سیرت کا جائزہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مختصراً پیش کرتے ہیں

'' رانی سوراج کے لیے لڑی، سوراج کے لیے جان قربان کی اور سوراج کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔''

یہ محض ایسے جذبات نہیں ہیں جو آج بھولی بسری یادوں پر ٹھونس دیے گئے ہیں۔ خود 1857 میں لوگ برطانوی حکومت کو شدید نفرت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغاوت کے ایک ''روزنامچے'' میں جسے سرجان منکاف نے مرتب کیا، نواب معین الدین حسن خاں کہتا ہے۔

'' میں بغاوت کی ابتدا کا حال اس بیان کے ساتھ شروع کرتا ہوں کہ انگریز خود حسبِ مرضی اپنے بارے میں خواہ کچھ ہی رائے رکھتے ہوں، ہندوستانی انھیں ظالم سمجھتے تھے اور برطانوی سلطنت میں اودھ کے الحاق سے یہ جذبہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا۔ اس واقعہ سے سب سے پہلے فوجیوں میں بے اطمینانی پھیلی جن کی اکثریت اس علاقے کی رہنے والی تھی۔ پھر بغاوت سے متعلق مختلف واقعات رونما ہوئے۔ کسان خوفناک مصائب کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ بہت سی ریاستیں تباہ ہوگئیں یا فتح کرلی گئیں۔ بہت سے خاندان اور بڑے بڑے شہر خاک میں مل گئے۔ بہت سے بیگناہوں کو پھانسی دی گئی۔ ہمہ گیر تباہی کے بادل سارے ملک پر چھا گئے۔''

غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت کی اس روایت کا لوک گیتوں میں متواتر اظہار ہوتا رہا۔ ایک بھوجپوری گیت میں مذکور ہے کہ غیر ملکی کی کمزور کشتی اب غضب ناک لہروں میں ڈگمگا رہی ہے:

'' بدیسیوں کی کشتی اب ڈگمگا رہی ہے
ملک مفلسی کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے
اس کی کشتی منجدھار میں ڈانواڈول ہے
ملک میں قحط اور بیماری کا زور ہے
مصیبت کے بادل گرج رہے ہیں
دریائے غم میں اتھاہ پانی ہے
ملک میں جبر و ستم کی آندھی زور سے چل رہی ہے
حاکم نشے میں مدہوش ہے
ہم اس سے التجا کرتے ہیں لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا

اے بدیسی تیری کشتی غرق ہونے والی ہے
دریا میں تیرا جنازہ نکلا ہی چاہتا ہے۔"(18)

قلت اور قحط کے حالات میں جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی دیرینہ خصوصیت ہے شاعر، شاعری اور عشق کو بھول جاتا ہے:

"قحط کے سبب ہم اپنے تمام نغمے بھول چکے ہیں
برہا، کجری، کبیر
اب حسن کا نظارہ بھی دل کو متاثر نہیں کرتا۔"(19)

ایک مالوی لوک گیت میں شاعر کہتا ہے:

"ملک مصیبت میں مبتلا ہے
فرنگی ملک پر حکمراں ہے
آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔"(20)

بھگت سنگھ جو اغیار کے خلاف 1857 کی بغاوت سے متاثر ہوا متعدد لوک گیتوں کا موضوع بنا۔ یہ گیت شہنشاہیت کے خلاف مزاحمت کی روایت کو زندہ رکھتے ہیں جو لوگوں نے مختلف اوقات پر جدوجہد کے ذریعے قائم رکھی۔ بھگت سنگھ کے بارے میں ایک لوک گیت ذیل کے مصرعے سے شروع ہوتا ہے:

"وہ پھانسی پر جھول گیا، بہادر بھگت سنگھ، غیرت مند بھگت سنگھ!"

ایک اور لوک گیت ایک محب وطن کی تصویر کھینچتا ہے جو پھانسی پر چڑھنے میں دیر ہو جانے کے سبب پیچ و تاب کھاتا ہے:

"اب ایک ایک لمحہ میرے لیے باعث عذاب ہے۔
میرے گلے میں رسی ڈال کر کیوں تامل کرتے ہو؟
میں غازی بن کر سیدھا بہشت میں جاؤں گا
اور دھرم راج کے حضور میں اپنے مصائب بیان کروں گا
اس سے بھگت سنگھ کو واپس چھین لوں گا۔"(21)

ایسے گیت غیر ملکی حکومت کے خلاف ہمارے لوگوں کی گہری نفرت کو زندہ رکھتے ہیں اور ہمارے ملک کے عام شعور کے اندازے کے لیے ایک پیمانے کا کام دیتے ہیں۔

ہندوستان کی قومی جدوجہد کے لیے بغاوت کا بیش قیمت ترکہ ہندو مسلم اتحاد کی روایت تھی جو اس دور میں قائم ہوئی۔ بہادر شاہ کے تخت اور رانی جھانسی کی فوجوں میں ہر جگہ ہندو اور مسلمان مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو کر دوش بدوش صف آرا ہوئے۔ معین الدین حسن خاں اپنی "غدر ڈائری" میں اس حقیقت پر زور دیتا ہے:

"یہ قرین قیاس ہے کہ یہ ایک مشترکہ اعلان تھا جو ہندو اور مسلمان باغیوں میں اتحاد کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک قابل قبول تاریخی حقیقت ہے کہ کمپنی کے الحاق اودھ کے واقعے سے بے اطمینانی بڑھ گئی اور یہی وجہ تھی کہ بغاوت کی آگ جلد تر بھڑک اٹھی۔ واقعہ اودھ کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر پڑا کیونکہ اودھ میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔"

قومی اتحاد کی یہ روایت بعد کی تمام بغاوتوں میں برقرار رہی مثلاً بحری عملہ اور آزاد ہند فوج کی بغاوتیں۔

جس چیز کو "غدر" کہا جاتا ہے وہ ہندوستانیوں کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف عوام کی بغاوت تھی۔ ہندی ادب میں معلوم اور نامعلوم ادیب اور شعرا کی تصنیفات ہماری قوم کی ان امنگوں اور جذبوں کی ترجمان ہیں جو سو سال پہلے برطانوی حکومت کے خلاف اس قدر بڑے پیمانے پر بغاوت کا سبب ہوئے۔

مصادر:

- ایس۔ ایل۔ ورشنے: "آدھونک ہندی ساہتیہ" صفحات 47-246
- ایضاً صفحہ 247
- ورما: "رانی لکشمی بائی آف جھانسی" صفحات 2-401
- "ہندی نورتن" صفحہ 598
- ورشنے: بحوالہ تصنیف صفحہ 273
- ایضاً صفحہ 274
- "کوتا کومدی" حصہ دوم صفحات 39-38
- ورشنے: بحوالہ تصنیف صفحہ 256
- بریڈلا۔ سواگت، صفحہ 10
- "بارڈک ہرش ورش" مطبوعہ 1900 صفحہ 11
- ورشنے: بحوالہ تصنیف صفحہ 250
- ایضاً صفحہ 251
- "بھارت بھارتی" صفحہ 87
- "گرامیہ" صفحہ 48
- "گل" صفحہ 47
- ایضاً صفحہ 53
- ایضاً تمہیدی اشعار
- ورما: بحوالہ تصنیف صفحہ 141
- ایضاً صفحہ 510
- "ڈائری آف دی میوٹنی" صفحہ 52
- کرشن دیو اپادھیائے "بھوجپوری گرام گیت" صفحات 84-383
- "کوتا کومدی" حصہ سوم صفحہ 27
- "پربھا" اگست۔ ستمبر 1956 صفحہ 15
- دیوندر ستیارتھی: "دھیرے بہوگنگا" صفحات 33-132
- ایضاً
- معین الدین حسن خاں: "غدر ڈائری آف دہلی" صفحہ 21-

□□□

اردو خبرنامہ

شیخ حسینہ "اندرا گاندھی ایوارڈ" سے سرفراز

● نئی دہلی۔ بنگلہ دیش کی وزیر اعظم شیخ حسینہ کو پیر کو امن، ترقی اور ترک اسلحہ کے شعبے میں اہم رول ادا کرنے کے لیے اندرا گاندھی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ جنوبی ایشیا میں امن اور ترقی کے لیے مشترکہ طور پر کام کرنا چاہیے۔ اندرا گاندھی کے ساتھ اپنی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے شیخ حسینہ نے اپنے والد شیخ مجیب الرحمٰن اور کنبے کے 18 دیگر اراکین کے قتل کا ذکر کیا۔ انھوں نے اندرا گاندھی کو اپنی ماں کی طرح بتاتے ہوئے کہا کہ اندرا گاندھی نے ہی ہمیں سیاسی پناہ دی اور 6 سال ہم دہلی میں رہے۔ صدر جمہوریہ نے ایوارڈ دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے سالانہ تعاون اور اعتماد کو مضبوط کرنے کے تئیں پرعزم ہے۔ پرتبھا پاٹل نے کہا کہ ہم تجارت، سرمایہ کاری اور ثقافتی لین دین بڑھانا چاہتے ہیں۔

شیخ حسینہ کو ایک ممتاز عالمی رہنما قرار دیتے ہوئے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا کہ پڑوسی ملک میں جمہوریت کی بحالی بہت حد تک ان کی ہمت، قربانی اور عوام کی قوت ارادی میں ان کے غیر متزلزل یقین کی ہی بدولت ہے۔ ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ آج کے سنگین چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے بین الاقوامی تعاون سے متعلق ان کی بصیرت جس کا اظہار پچھلے سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان کی تقریر میں ہوا تھا، آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو دل سے عزیز ہوتی اور آج محترمہ حسینہ کو جو اعزاز دیا جائے وہ اس کی دل سے توثیق کرتیں۔ انھوں نے کہا کہ بنگلہ دیش کی عظیم بیٹی کو اس سال کا یہ انعام دیا جانا بہت مناسب ہے۔ محترمہ حسینہ کو علاقائی امن، سلامتی اور ترقی کے لیے انتھک جدوجہد کرنے والی شخصیت قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر سنگھ نے اس کا اعتراف کیا کہ ان کا راستہ آسان نہیں تھا تاہم انھوں نے اپنی بے لوث خدمات سے سربراہ سونیا گاندھی نے کہا کہ ہم ایک پرامن، سیکولر اور جمہوری بنگلہ دیش کی تمنا رکھتے ہیں اور ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کی (شیخ حسینہ) قیادت میں یہ ممکن ہوگا۔ اندرا گاندھی کو ایک ہمت ور خاتون بتاتے ہوئے یوپی اے سربراہ نے کہا کہ ملک اور غیر ممالک میں زبردست مخالفت کے درمیان اگر ان کی قیادت نہ ہوتی تو ہندوستان کی تصویر کچھ اور ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان اتنی ہی ہمت ور ایک اور خاتون کو اعزاز سے نواز رہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ملک میں قائم ہوں گے 6 ہزار ماڈل اسکول

● نئی دہلی۔ ملک کے مختلف حصوں میں اسکولی نصاب میں یکسانیت لانے کے لیے سرکار کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے فروغ انسانی وسائل کے وزیر کپل سبل نے آج کہا کہ خواتین کے علاوہ پسماندہ طبقے درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے طلبہ پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے 6 ہزار ماڈل اسکول کھولے جائیں گے۔ کپل سبل نے لوک سبھا میں وقفۂ سوالات کے دوران امرناتھ پردھان، حکم دیو نارائن یادو وغیرہ کے سوالات کے جواب میں یہ اطلاع دی۔ انھوں نے کہا کہ وہ یونیفارم تعلیم کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن اسے نافذ کرنے میں کئی رکاوٹیں بھی ہیں۔ بنیادی ڈھانچے میں یکسانیت لائی جاسکتی ہے لیکن تعلیم میں ایسا کرنے میں کئی مشکلات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 6 ہزار ماڈل اسکولوں میں 3500 اسکول پسماندہ بلاکوں میں کھولے جائیں گے۔ سرکار کی کوشش ہر بلاک میں ایک ماڈل اسکول قائم کرنے کی ہے۔ انھوں نے اسکولوں میں خواتین کے لیے الگ سے بیت الخلا بنائے جانے پر بھی زور دیا۔ کپل سبل نے کہا کہ سیکنڈری ایجوکیشن میں بہتری لانے کے لیے مرکز کی جانب سے مجوزہ اسکیم راشٹریہ مادھمک شکشا ابھیان شروع کیا گیا ہے۔ مرکز کی جانب سے مجوزہ اسکیم پنج سالہ منصوبہ میں 20120 کروڑ روپے مخصوص کیے گئے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اقلیتی طلبہ کے لیے قومی فیلوشپ اسکیم

● نئی دہلی۔ تعلیم کے میدان میں اقلیتوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے سرکار نے کئی اہم اقدامات کا اعلان کیا ہے۔ اگر ان پر صدق دلی سے عمل کیا گیا تو دور رس اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ مرکزی حکومت نے اقلیتی طلبہ کے لیے ریسرچ کرنے کا راستہ اور آسان کردیا ہے۔ حکومت نے ان کے لیے خاص طور پر قومی اسکالرشپ اسکیم شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد قومی اسکالرشپ کے لیے انھیں قومی یا ریاستی سطح پر مقابلہ جاتی امتحان بھی نہیں دینے پڑیں گے۔ مرکزی وزیر مملکت برائے اقلیتی امور سلمان خورشید نے آج پریاورن بھون میں واقع وزارت اقلیتی امور کے دفتر میں منعقد پریس کانفرنس کے دوران اقلیتی فرقوں کے طلبہ کے لیے اعلیٰ تعلیم میں فیلوشپ اور ریاستی وقف بورڈوں کے تمام ریکارڈس کو کمپیوٹرائز کیے جانے کی اسکیموں کے آغاز کا اعلان کیا۔ اس موقع پر یو جی سی (یونیورسٹی گرانٹ کمیشن) کے چیئرمین پروفیسر سکھ

دیوتھورٹ بھی موجود تھے۔

سلمان خورشید نے میڈیا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس فیلوشپ اسکیم کا مقصد اقلیتی فرقوں کے طلبہ کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کے لیے 5 سال تک وظیفہ مہیا کرانا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس فیلوشپ اسکیم پر یو جی سی کے ذریعے عمل کرایا جائے گا۔ اس اسکیم کے تحت ہر سال 756 طلبہ کو فیلوشپ دی جائے گی جن میں سے 30 فیصد فیلوشپ طالبات کے لیے محفوظ ہوں گی۔ البتہ طالبات میں اہل اسکالر نہ ملنے پر ان کے کوٹے کے باقی وظائف کو دوسرے طلبہ کو منتقل کر دیا جائے گا۔ باقی طلبہ کے لیے ریزرویشن یو جی سی کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ فیلوشپ حاصل کرنے والے طلبہ کے والدین کی سالانہ آمدنی کی حد ڈھائی لاکھ روپے طے کی گئی ہے، ساتھ ہی انھیں میرٹ میں کھرا اترنا ہوگا، حالانکہ اس کے لیے نیٹ یا سلیٹ کو پاس کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسکالرشپ میں شروعاتی 2 سالوں (جونیئر ریسرچ فیلو) میں 12 ہزار اور اس کے بعد کے برسوں میں (سینئر ریسرچ فیلو) 14 ہزار روپے فی ماہ دیے جائیں گے۔ کنٹی جینسی مد میں آرٹس اور کامرس کے طلبہ کو شروعاتی 2 سال کے لیے 10، 10 ہزار روپے اور اس کے بعد کے 3 برسوں کے لیے 20500 روپے دیے جائیں گے، جبکہ سائنس اور انجینئرنگ کے طلبہ کو اس مد میں شروع کے دو سالوں کے لیے 12 ہزار اور بعد میں 3 سالوں کے لیے 25 ہزار روپے دیے جائیں گے۔ جونیئر ریسرچ فیلوشپ کی اوسط رقم 157666 روپے سالانہ ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ رواں مالی سال 10-2009 کے لیے اس مد میں 15 کروڑ روپے کا بجٹ مختص کیا گیا ہے۔

اس موقع پر سلمان خورشید نے ریاستی وقف بورڈوں کے تمام ریکارڈس کو کمپیوٹرائز کیے جانے کی اسکیم شروع کرنے کا اعلان بھی کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس اسکیم کا مقصد ملک بھر میں وقف کی تمام جائیدادوں کی ایک فہرست مرتب کرنا ہے اور وقف املاک پر موجود ناجائز قبضوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے۔ ان کے علاوہ اس اسکیم میں متولی ریٹرنس مینجمنٹ سسٹم، وقف کی املاک سے متعلق مقدمات کی نگرانی سے متعلق مینجمنٹ سسٹم، پراپرٹی مینجمنٹ سسٹم کو پٹے پر دیا جانا، وقف بورڈوں کے ریکارڈس کا ڈیٹا بیس تیار کرنا اور وقف کے ڈاٹا کی ریونیو محکموں کے ذریعے تصدیق کرانا وغیرہ شامل ہے۔ یہ اسکیم ملک بھر میں تمام 29 ریاستی وقف بورڈوں پر یکساں طور پر نافذ ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ اس اسکیم کو 10-2009 سے 12-2011 کے دوران 22.84 کروڑ روپے کی رقم سے عمل میں لانا ہے۔ مدارس کے تعلق سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سلمان خورشید نے کہا کہ یہ معاملہ ان کا نہیں بلکہ وزارت فروغ انسانی وسائل سے متعلق ہے اور مدارس کی حالت کو سدھارنے کے لیے حکومت کی جانب سے کوششیں جاری ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

این سی پی یو ایل مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے مواد فراہم کرائے گی

● نئی دہلی۔ 11 جنوری، قومی اردو کونسل کی کمیٹی آن ڈسٹینس لرننگ (Committee Distance on Learining) کی میٹنگ پروفیسر نسیم بھالیہ کی کنوینر شپ میں آج قومی اردو کونسل کے کمیٹی روم میں 11:30 بجے منعقد ہوئی جس میں پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی (شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) پروفیسر غضنفر علی سینٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو ٹیچر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) جناب ملک العزیز (چنئی) اور جناب سید پرویز (نئی دہلی) نے شرکت کی۔ اسپیشل انوائٹی کے طور پر جناب چندر بھان خیال (وائس چیئرمین، قومی اردو کونسل) نے بھی شرکت کی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے میٹنگ کا آغاز کرتے ہوئے اس کے ایجنڈے پر روشنی ڈالی، کمیٹی نے ''یک سالہ اردو ڈپلوما کورس'' کے 63 سنٹر'' دو سالہ ڈپلوما ان فنکشنل عربک کے 36 سینٹر اور ''یک سالہ سرٹیفکیٹ ان فنکشنل عربک'' کے 31 نئے سینٹر منظور کیے۔ اس طرح ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ان مراکز کی تعداد 317,652 اور 272 ہو جائے گی۔ اس اسکیم کے تحت تعلیمی مواد کی فراہمی، اساتذہ کی گرانٹ ان ایڈ، اسٹیشنریز وغیرہ پر تقریباً 9 کروڑ سے زائد خرچ ہوں گے۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جو طلبہ اردو، عربی اور فارسی زبان کو مسابقتی امتحانوں (Competative exams) بالخصوص آل انڈیا سول سروسیز اور اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں میں شرکت کریں گے، ان کو تعلیمی مواد کی فراہمی اور ضروری تربیت کے لیے کونسل اپنے مصارف پر مراکز قائم کرے گی۔ کمیٹی نے عربی زبان کا انٹرپریٹیشن (Interpretation) کورس بھی Usmania University, IFO, new college of اور DU, JNU, MANUU, AMU, JMI commerce میں قائم کرنے کا فیصلہ لیا تاکہ عربی طالب علم روزگار سے جڑ سکیں۔ اس کے لیے مختلف یونیورسٹیوں کے شعبوں سے وابستہ عربی اساتذہ کی جلد ہی ایک میٹنگ کی جائے گی۔

اردو غزل آزادی کے بعد

● نئی دہلی۔ معاصر غزل کا مزاج عاشقانہ کم سماجی محرومی اور بے بسی کا زیادہ ہے۔ آج کی غزل رومانی نہیں بلکہ غیر رومانی اور انسانی قدروں کے زوال کی ترجمان ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے قمر رئیس سلور جوبلی ہال میں ''اردو غزل آزادی کے بعد'' کے عنوان سے منعقدہ سہ روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔

افتتاحی تقریب کی صدارت معروف شاعر بشر نواز اور نظامت پروفیسر ارتضی کریم نے کی۔ انیس اعظمی نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو غزل کو تمام اصناف میں مرکزی صنفِ سخن قرار دیا اور کہا کہ تیس چالیس سالوں میں اردو غزل دیگر تمام اصناف کو پھر دبانے لگی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مشہور شاعر خلیل مامون نے معاصر غزل کے نئے رجحانات پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں بزرگ اور کہنہ مشق شاعر بشر نواز نے اپنے صدارتی خطبے میں ہم عصر غزل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ پیش کیا۔ اس سے قبل اردو اکادمی کے کارگزار وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی نے غزل چھیڑی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم عمر رفتہ کو آواز دیں اور اس کے لیے ہمیں اردو کی تہذیبی اقدار، روایات اور اس کے شاندار کارناموں کو یاد کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اردو کا تعلق روزی روٹی سے نہیں ہے، آخر میں سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ ادبی اصناف کو پرکھنے کے لیے طریقے کھوجنے چاہئیں کیونکہ زمانہ بتدریج ترقی کرتا ہوا بہت آگے جاچکا ہے۔ غزل جو کل تھی وہ آج نہیں ہے تو یقیناً مستقبل میں جو غزل لکھی جائے گی وہ آج جیسی نہیں ہوگی۔ غزل کو نظم نے نقصان نہیں پہنچایا بلکہ غزلوں کے انداز میں نظم لکھنے سے نظموں کا نقصان ضرور ہوا ہے۔

ان خیالات کا اظہار پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اردو اکادمی میں جاری سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں کیا۔ مجلس صدارت کے دوسرے رکن سلیم شہزاد نے اجلاس کے دوران پڑھے گئے مقالات پر اپنی رائے پیش کی۔ پروفیسر اسلم پرویز نے غزل کے تعلق سے کہا کہ غزل میں شاعر کی ایک سائیکی ہوتی ہے جس میں کئی چیزیں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ جن میں لفظیات، بحور اور قوافی وغیرہ کا انتخاب شامل ہیں۔ اس سے قبل سیمینار میں چار مقالات پڑھے گئے۔ پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی نے ''غزل تنقید آزادی کے بعد'' پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''معاصر غزل پر ہونے والے مباحث'' اور پروفیسر عتیق اللہ نے ''غزل اور محاکمۂ غزل'' کے عنوان سے مقالے پڑھے۔ آخر میں پروفیسر وہاب اشرفی نے ''اردو غزل کے صنفی پہلو اور ہمارے نقاد'' کے عنوان پر مقالہ پڑھا۔ فرحت احساس اور ممتاز عالم رضوی نے کچھ مقالات پر سوالات بھی کیے جن کا جواب مقالہ نگاروں نے نہایت بردباری اور سنجیدگی سے دیا۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر احمد امتیاز نے کی۔

دوسرے سیشن میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی نے ہندوستان میں غزل کے تعلق سے ڈاکٹر خالد علوی کے خیالات پر حیرت کا اظہار کیا۔ وہاب اشرفی نے کہا کہ ہندوستانی شعریات پر بحث کرتے وقت ہم لامحالہ سنسکرت شعریات سے ہی استفادہ کرتے ہیں۔ ہمیں یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر ایک شاعر دوسرے شاعر سے کیوں منفرد ہے۔ انھوں نے کہا کہ فلاں شاعر اچھا ہے اور فلاں خراب پہلے اس کا پیمانہ طے کرنا ہوگا۔ روانی میں کسی کو رد کر دینا اور کسی کو سند یافتہ قرار دینا فال نیک نہیں۔ انھوں نے پاکستان کی فاطمہ حسن کی اس شکایت کی بھی کہ یہاں مقالوں میں پاکستان کی شاعرات کا ذکر نہیں ہو رہا ہے وضاحت کی۔

پروفیسر ارتضی کریم نے اس سیشن کے مقالات پر مایوسی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمارے مقالہ نگار ہم عصر شعرا کو بغیر پڑھے اپنا مقالہ سپرد قلم کر دیتے ہیں جو مناسب نہیں۔ پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ ہندوستان میں اردو غزل کے امکانات نہایت روشن ہیں۔ دوسرے اجلاس کی محفل صدارت میں پروفیسر ارتضی کریم، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر بیگ احساس اور پاکستان کی معروف شاعرہ فاطمہ حسن شامل تھیں۔ نظامت ڈاکٹر زاہد الحق نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر خالد علوی نے ''نئے تخلیقی رویے اور غزل'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ جب کہ شائستہ یوسف نے ''غزل کا نیا طرز احساس''، ''ش.ک. نظام نے ''غزل اور نیا طرز احساس''، ڈاکٹر یعقوب یاور نے ''غزل کے نئے امتیازات'' اور پروفیسر سلیم شہزاد نے ''غزل روایت اور انفرادی تجربہ'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 20 دسمبر، اردو ادب کی تاریخ میں غزل واحد صنف سخن ہے جس پر کبھی زوال نہیں آیا کیونکہ غزل عوام سے جڑی ہوئی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ابن کنول نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ کل ہند سیمینار ''اردو غزل آزادی کے بعد'' کے اختتامی اجلاس میں بطور صدر اپنا خطبہ پیش کر رہے تھے۔ پروفیسر کنول نے سیمینار کی کامیابی پر اردو اکادمی کو مبارکباد بھی پیش کی اور امید ظاہر کی کہ اس سیمینار سے غزل پر از سرنو بحث کا آغاز ہوگا۔ علاوہ ازیں تیسرے دن کے پہلے اجلاس کا خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے اردو غزل کے وسیع ہوتے حلقے کا تنقیدی جائزہ لیا اور ہندی غزل پر لکھے قاسم خورشید کے مقالے پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے مقالات پر گفتگو کرتے ہوئے وضاحت کی کہ کسی شاعر یا ادیب نے اگر اتر پردیش یا بہار سے دہلی میں نقل مکانی کی ہے تو اس کا ذکر یقیناً دونوں جگہ ہوگا۔ پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی نے سیمینار کو نہایت کامیاب قرار دیا۔ اس سے قبل آج کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر قاسم خورشید نے ''ہندی غزل آزادی کے بعد''، ڈاکٹر فرید پربتی نے ''جموں و کشمیر میں اردو غزل 74 کے

بعد"، پروفیسر صغیر افراہیم نے "اتر پردیش میں اردو غزل آزادی کے بعد"، پروفیسر خالد محمود نے "دہلی میں اردو غزل آزادی کے بعد ایک عمومی جائزہ" اور پروفیسر بیگ احساس نے "آندھرا پردیش میں اردو غزل آزادی کے بعد" کے عنوانات سے مقالے پیش کیے۔ نظامت عمیر منظر نے کی۔ پروفیسر صادق نے تمام مقالوں پر مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سرورالہدیٰ کے مقالے میں ہجرت کے ذکر پر اعتراض کیا اور وضاحت کی کہ ہجرت کا تعلق اگر سروس بزنس یا تلاشِ معاش سے ہو تو اسے ہجرت کا حوالہ نہیں بنایا جاسکتا انھوں نے مخمور سعیدی کے مقالے پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر سرورالہدیٰ، پروفیسر حمید سہروردی، پروفیسر نعمان، بشرنواز، مخمور سعیدی اور پروفیسر شمیم حنفی شامل تھے۔ آخر میں پروفیسر عتیق اللہ نے بحیثیت سیمینار کنوینر تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور اس توقع کا اظہار کیا کہ اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی کی معاونت شامل رہی تو آئندہ بھی ایسے ہی سیمینار منعقد کیے جاتے رہیں گے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

رامپور رضا لائبریری کے زیر اہتمام
ترجمے اور تدوین کے مسائل پر سہ روزہ سیمینار

● رام پور۔ 21 دسمبر، مغرب کی جامعات اور اہل علم ترجمے کو زبانوں کے درمیان باہمی تعامل کے ساتھ ساتھ تہذیبوں اور معاشروں کے درمیان راہ و رسم کے وسیلے کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ اس خیال کا اظہار ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے رضا لائبریری رام پور کے زیر اہتمام "ترجمہ و تدوین مسائل اور حل" کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ترجمہ اگر تہذیبوں کے درمیان افہام و تفہیم اور تعارف و تقرب کی کوشش ہے تو یہ کام اسلامی تہذیب نے مدینۂ منورہ میں اولین اسلامی معاشرے کے قیام کے ساتھ ہی شروع کردیا تھا۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمۂ قرآن کے حوالے سے کہا کہ یہ ترجمۂ قرآن، ترجمے سے مسلمانوں کے دیرینہ شغف کا ہی غماز نہیں ہے بلکہ ترجمے کے عمل پر غور و فکر اور اس کے نتائج کا بھی اشاریہ ہے جو شاہ صاحب نے مرتب کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ترجمے کے فن میں مغربی محققین کے اکتسابات سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی روایت سے پیوستہ کسی علمی منہاج کو مرتب کرنے پر بھی زور دیا۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر سوریہ پرساد دکشت نے کہا کہ ہمارا ملک بے شمار زبانوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور ہر تہذیبی روایت نے اس ملک کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ موجودہ دور میں جہاں تکنیکی علوم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے وہاں نئی نسل میں زبانوں کے تئیں ایک نوع کی بے پروائی ہمارے معاشرے میں در آئی ہے۔

انھوں نے اس نئی نسل میں زبان کے تئیں بیداری پیدا کرنے پر زور دیا مہمان خصوصی ڈاکٹر ابراہیم السلطان (کلچرل اتاشی، سفارت خانہ مملکت سعودیہ عربیہ، دہلی) نے ترجمے کی روایت اور اس سے علم و معرفت حاصل کرنے والی اقوام کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ عہد عباسی میں ترجمے کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے افکار و نظریات کو اہل عرب نے سب سے پہلے عباسی دور حکومت میں ترجمے سے ہی جانا۔

پروفیسر صغریٰ مہدی نے ترجمے اور تدوین کو زبان کی وسعت اور ادب کی توسیع کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا اور کہا کہ مترجم کو دونوں زبانوں سے واقفیت ضروری ہے۔ صدارتی خطاب میں جسٹس سہیل اعجاز صدیقی (چیئرمین، نیشنل فار مائناریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ، حکومت ہند) نے کہا کہ ہمارے معاشرے کو نئی جہت اور علمی بلندی دینے میں مترجمین کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ دیگر سائنسی اداروں کی طرح مترجمین کی بھی ایک قومی سطح کی کونسل ہونی چاہیے۔ تاکہ نئی نئی اصطلاحات کے متبادل وضع کرنے میں کونسل اہم کردار ادا کرسکے۔ افتتاحی اجلاس میں رضا لائبریری کے افسر بہ کار خاص پروفیسر شاہ عبدالسلام نے مہمانوں کا استقبال کیا اور رام پور اور خاص طور پر رضا لائبریری کی علمی اور تہذیبی خدمات کا ذکر کیا۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز ڈاکٹر انوار احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروفیسر سوریہ دکشت نے شمع روشن کی۔ آخر میں ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے کلمات تشکر ادا کیے۔

سیمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کی صدارت میں ہوا، اس اجلاس میں فرحت احساس نے تخلیقی ترجمے کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ تخلیقی ترجمے کی حتمی تعریف متعین نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے ترجمے کو دو زبانوں کے درمیان ایسی شادی سے تعبیر کیا جو دو خاندانوں کی رضامندی سے کی جاتی ہے۔ اسد رضا نے صحافت کی زبان اور اس کے ترجمے کے مسائل پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری نے ترجمے کے فن پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر غضنفر نے "دنیائے طباعت و اشاعت کا گمشدہ کردار" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے اس اجلاس کی نظامت کی۔ دوسرے دن کا پہلا اجلاس پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر خالد محمود کی صدارت میں شروع ہوا۔ ابتدا میں پروفیسر شاہد عبدالسلام نے کہا کہ ترجمہ و تدوین ایسے موضوعات ہیں جن پر بار بار غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اسی کے پیش نظر مختلف زبانوں کے ماہرین اور دانش وروں کو یہاں جمع کیا گیا ہے۔ پروفیسر نعمان خاں نے قدیم متون کی تدوین سے متعلق مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ

ہندوستان میں تدوین متن کا سلسلہ نہایت قدیم ہے۔ پروفیسر ظہیر حسین عابدی نے کہا کہ ترجمے کو عربوں نے پروان چڑھایا اور الجبرا اور سائنسی وطبی کتابوں کے تراجم کے ذریعے ترجمے کو ایک فن کا درجہ عطا کیا۔ پروفیسر اشوک کمار نے صحافتی ترجمہ نگاری کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر ظفرالدین نے نصابی کتابوں کے تراجم کے موضوع پر مقالہ پڑھا انھوں نے کہا کہ نصابی کتب کے تراجم میں احتیاط لازمی ہے اور ساتھ ہی طلبہ کی ذہنی استعداد کو پیش نظر رکھنا ازحد ضروری ہے۔ ڈاکٹر شہزاد انجم نے نثری اور منظوم تراجم کے فرق پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ نظم کے مقابلے میں تخلیقی نثر کا ترجمہ نسبتاً آسان ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر مشیر حسین صدیقی نے عربی نثر کے نصاب کی تدوین اور مولانا ابوالحسن ندوی کے عنوان پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر محمد ایوب ندوی نے طلبہ کے حوالے سے ترجمہ کی مشکلات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے ترجمۂ اصطلاحات اور اصطلاحات سازی پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے ترجمے کو دو تہذیبوں کے درمیان رابطے کا پل قرار دیا۔ ڈاکٹر زکی نور نے حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف تراجم کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ پروفیسر بدرالدین الحافظ نے قرآن پاک کے مختلف اردو تراجم کا خصوصیت سے ذکر کیا اور کہا کہ اردو زبان کے سرمایے میں یہ ایک نہایت گراں قدر اضافہ ہیں۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ ترجمے کی مشکلات اپنی جگہ لیکن محنت اور لگن سے اس مشکل پر بہت حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

اس سہ روزہ قومی سیمینار کا آخری اجلاس پروفیسر احسن الظفر کی صدارت میں ہوا، آخری اجلاس کی نظامت عمیر منظر نے کی۔

پروفیسر عماد الحسن آزاد فاروقی نے عمر خیام کی رباعیات کے انگریزی ترجمے پر مضمون پڑھا جو ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے 1857 میں کیا تھا۔ پروفیسر آزاد فاروقی نے کہا کہ عمر خیام کی رباعیوں کے موضوعات اہل یورپ کے تہذیب و افکار سے زیادہ میل کھاتے ہیں اسی وجہ سے انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت اور فن کے موضوع پر پروفیسر خالد محمود نے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ مطالعہ، تجربہ، مشق اور ذوق سلیم اس فن کے لیے بہت ضروری ہے۔ پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی نے عربی مخطوطات کی ایڈیٹنگ کے اصول پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے فارسی مخطوطات کی تدوین وتراجم سے متعلق مقالہ پڑھا۔ انھوں نے مختلف مثالوں کے ذریعے بتایا کہ ہمارے یہاں تدوین کے بہت اچھے نمونے ہیں البتہ جس احتیاط اور توجہ کی ضرورت تدوین کے لیے ہوتی ہے اس کا بہت سی جگہوں پر خیال نہیں رکھا گیا ہے اسی لیے اس طرح کے کاموں میں غلطیاں ملتی ہیں۔

پروفیسر شمس تبریز نے قرآن کریم کے تراجم: پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے بتایا کہ تراجم کی سب سے زیادہ سرپرستی عہد عباسی میں کی گئی۔ البتہ ہندوستان میں قرآن پاک کے جو اردو تراجم ہوئے انھیں فن ترجمہ نگاری کا ایک حیرت انگیز کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر نے کہا کہ اس کے اولین نقوش ہندوستان میں عہد شاہ جہاں سے شروع ہوجاتے ہیں اور اس کا سلسلہ عہد بہ عہد جاری رہا ہے۔ ڈاکٹر حسن عباس نے ترجمے کی روایت، اہمیت اور افادیت پر مقالہ پڑھا انھوں نے کہا کہ ترجمے اگرچہ مختلف ضرورتوں کے تحت ہوئے مگر ان سے ہماری تہذیب، مذہب اور ثقافت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔ پروفیسر اقتدار محمد خاں نے قرآن مجید کے انگریزی تراجم پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی زبان میں قرآن کا اولین ترجمہ الیکو نڈر روس نے کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ قرآن کریم کے بیشتر انگریزی مترجمین عربی زبان سے ناواقف تھے۔ انھوں نے یورپین زبانوں اور جرمن زبان کے تراجم سے ترجمہ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان ترجموں پر کافی تنقید کی گئی۔ ڈاکٹر صہیب عالم نے جدید ہندوستانی کتابوں کے عربی تراجم پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر شاہ عبدالسلام نے شاعری کے ترجمے پر گفتگو کی اور کہا کہ شاعری کے ترجمے میں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ لہجے اور تلمیحات و استعارات کا ترجمہ کرنا بے حد دشوار کن مرحلہ ہوتا ہے۔ جس کے بغیر شاعری کا بہتر ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر کشور سلطانہ، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر محمد عرفان، اور ماریہ مسعود نے بھی مقالے پڑھے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر احسن الظفر نے مقالہ نگاروں کی کوششوں کو سراہا۔ اختتامی اجلاس ڈاکٹر وسیم اختر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر ایک قرارداد بھی پیش کی گئی۔ ڈاکٹر وسیم اختر نے رضا لائبریری کی کوششوں کو سراہا اور سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد دی۔ انھوں نے کہا اس سے فن ترجمہ اور تدوین کو نئی جہت ملے گی۔ (ڈاک سے)

اردو ایک ہزار برس کی مخلوط تہذیب کی امین ہے

● نئی دہلی۔ اردو تہذیبی اختلاط اور تکثیریت سے پیدا ہوئی، جو لوگ اردو کو فرقہ واریت اور تنگ نظری سے جوڑتے ہیں وہ اردو کے مزاج شناس نہیں۔ اردو گذشتہ ایک ہزار برس کی مخلوط تہذیب کی امین ہے۔ قوس قزح کی طرح ایک ست رنگی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 2 روزہ قومی سیمینار ''میں کیوں اور کیسے لکھوں'' کے اختتامی اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ گوپی چند نارنگ نے کہا کہ فرد اور زبان کا رشتہ اختیار کا نہیں، لازمیت کا ہوتا ہے۔ زبان خون اور ہڈیوں کے گودے میں اس طرح شامل ہوتی ہے جس طرح لہو کی روانی میں ڈی.این.اے. آزادی سے پہلے اردو پورے برصغیر پر حکومت کرتی

تھی، بعد میں یہ تقسیم کی زبان بنادی گئی۔ انھوں نے کہا کہ ہر چند کہ زبانوں کا مذہب نہیں ہوتا لیکن اردو اور ہندی دونوں کو غلط سیاسی رنگ دیا گیا اور اردو اپنے گھر میں بے گھر ہوگئی۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے ادبی سفر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ زبان جو ایک ہزار برس کی ہندوستانی تہذیبی روح کی ترجمان ہے، فرقہ واریت کی زبان کیسے ہوسکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو میں میر و غالب، انیس و اقبال کی شاعری میں جو حسن کاری ہے اور اردو کی دلکشی اور جادوئی کشش کا راز کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کا ادبی ایجنڈا ہمیشہ اردو کی جمالیاتی و تہذیبی کشش کے بھید کو پانے کا رہا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ انھوں نے زیادہ توجہ یک موضوعی کتابوں پر دی جو اردو کی ثقافتی حیثیت کو مضبوط کرسکیں۔ اس نوعیت کا پہلا سیٹ ان کی تین کتابیں ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں''، ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب'' اور ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری'' ہیں۔ نیز ''سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ'' اور ''امیر خسرو کا ہندوی کلام'' کو بھی اسی شق سے متعلق سمجھنا چاہیے۔ اپنی تصنیفات ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' اور ''اردو زبان ولسانیات'' کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ میرے علمی کمٹمنٹ کا تیسرا پڑاؤ ہے۔ چوتھی جہت کے طور پر ان کتابوں کو دیکھنا چاہیے جو میں نے ان اداروں کے لیے لکھیں جن سے میں وابستہ رہا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مصنف کے لیے اپنا محاسبہ بھی ضروری ہے اور ہر حساس مصنف کی طرح میرا سفر بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے، باقی فیصلہ ہمیشہ تاریخ کرتی ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر ستیندر سنگھ نور نے اس موقع پر کہا کہ گوپی چند نارنگ جس ادارے میں بھی رہے اسے چار چاند لگادیے۔ ساہتیہ اکادمی کے دورِ صدارت میں ان کا دور بہت یادگار رہا ہے۔ اس موقع پر ساجد رشید نے بھی اپنے تخلیقی سفر پر روشنی ڈالی۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

تربیت تعلیم سے زیادہ اہم

● نئی دہلی۔ بچوں کی تربیت تعلیم سے زیادہ اہم ہے۔ بچپن میں جو اچھی عادتیں بچوں میں ڈال دی جاتی ہیں، ان سے زندگی آسان ہوجاتی ہے۔ وہ بچے کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہیں جن کے والدین ان کی تعلیم و تربیت میں انہماک کے ساتھ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ہمدرد کے چانسلر اور ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری سید حامد نے ہمدرد پری پرائمری اسکول اوکھلا شاخ کے تیسرے سالانہ جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے کیا جس کا اہتمام ہمدرد پبلک اسکول سنگم وہار میں کیا گیا تھا۔ انھوں نے والدین کو اپنے بچوں کی رفتار تعلیم پر پابندی کے ساتھ نظر رکھنے کی صلاح دیتے ہوئے کہا کہ بچوں کی بہتر زندگی کا انحصار والدین اور استاد کے باہمی ربط پر ہوتا ہے۔

جنوبی دہلی حلقے کے پارلیمانی رکن سندیپ دیکشت جلسے کے مہمان خصوصی تھے۔ اپنی تقریر میں پرائمری درجات کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ سیکھتا ہے، اس کا 80 فیصد حصہ 5-6 سال کی عمر تک سیکھ جاتا ہے۔ صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی اہلیت بھی اس عمر میں آتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عنقریب دو اسکول اوکھلا میں کھولے جائیں گے جبکہ مرکزی سرکار نے ایک سینٹرل اسکول علاقے میں قائم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ انھوں نے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی سے اپیل کی کہ ہمدرد پبلک اسکول تعلیم آباد جیسے کیمپس والا اسکول اوکھلا حلقے میں بھی کھولا جائے۔

ہمدرد پری پرائمری اسکول اوکھلا برانچ کی انچارج ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ نے استقبالیہ کلمات میں اسکول کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم اور غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے بچوں میں اعتماد پیدا کرنا ان کی اور ان کے عملے کی اولین ترجیح ہے۔

اس موقع پر ننھے ننھے بچوں نے ''ماں تجھے سلام'' کے عنوان سے میوزک پلے کے ذریعے حاضرین کا دل جیت لیا۔ اس موسیقی ڈرامے میں عظیم شخصیات کی کامیابی میں ماؤں کے رول اور قربانی کو اجاگر کیا گیا۔ طلبہ اور طالبات نے دیگر ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے۔ کے جی (اے) کے طالب علم سید حسیب الرحمٰن نے قرأت کرکے تقریب کا آغاز کیا جبکہ کے جی (ڈی) کے عاکف رشید اور مدیحہ مشرف نے نظامت خوبصورت انداز میں کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مدارس کو بھی جدید تعلیم سے آراستہ کرنا ضروری

● آل انڈیا دینی مدارس بورڈ کے قومی صدر مولانا محمد یعقوب بلند شہری نے کہا کہ مدارس کو بھی جدید تعلیم سے آراستہ کیا جائے تاکہ مسلم طلبہ بھی کمپیوٹر تکنیک اور ریاضی سیکھ سکیں۔ وہ یہاں مسلم مسافر خانے میں آل انڈیا دینی مدارس بورڈ کے ''تعمیر ملک وملت کارواں'' کے جے پور پہنچنے پر منعقد اجلاس سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ قومی ترقی کے لیے لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ لندن سے آئے ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین عیسیٰ منصوری نے کہا کہ مدرسوں میں عصری تعلیم ایک بنیادی ضرورت ہے اور آج آگے بڑھنے کے لیے دین کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی حاصل کرنی ہوگی۔

اس موقع پر جماعت اسلامی ہند کے محمد سلیم انجینئر نے کہا کہ آج انسان کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے کی ضرورت ہے۔ انسان صحیح معنوں میں اگر خدا کا بندہ بن جائے تو یہی اسلامی دعوت ہے۔ انھوں نے ملت اسلامیہ میں

اتحاد و اتفاق پر زور دیا۔ مہمان خصوصی قاری محمود الحسن نے کہا کہ ہر شخص اپنی ذمے داریوں کو سمجھے اور آپسی تنازعات بھلا کر قوم اور ملک کے لیے کام کرے۔ اجلاس کی صدارت کر رہے آل انڈیا مسلم فرنٹ کے منتظم قاری معین الدین نے کہا کہ تعلیمی پسماندگی دور کر کے مسلمان اپنے بچوں کو جدید تعلیم کی جانب راغب کریں۔ اجلاس کے منتظم عبدالسلام جوہری تھے۔ پروگرام کا آغاز محمد یوسف کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا اور عابد حسین نے نعت پیش کی۔ وسیم قریشی، نعیم الدین، شبیر احمد خان اور سبحان ایڈوکیٹ نے مہمانوں کا استقبال کیا، نظامت ڈاکٹر اظہار یزدانی نے کی، جبکہ دعا بورڈ کے قومی صدر محمد یعقوب نے کروائی۔ اس کے بعد آل انڈیا دینی مدارس بورڈ کا ایک وفد وزیر اعلیٰ اشوک گہلوت سے ملا اور انھیں مختلف مسائل پر مبنی میمورنڈم پیش کیا۔ وزیر اعلیٰ کو پیش کیے گئے میمورنڈم میں مسلمانوں سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے اور جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب ماہر، کامل اور معلم کے نصابوں کو دوسری ریاستوں کی طرح راجستھان میں بھی دوسری ڈگریوں کے مساوی قرار دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان مدرسہ بورڈ میں چیئرمین کی تقرری، سکریٹری اور ممبران کی تقرری کے ساتھ ساتھ راجستھان اردو اکادمی، راجستھان حج کمیٹی، اقلیتی اقتصادی کمیشن میں تعلیم یافتہ افراد کی تقرری کا مطالبہ کیا گیا۔ وفد نے یونانی میڈیکل کالج کھولنے وقف کمیٹیوں کے تحفظ و ترقی پر توجہ دینے، اجمیر اور ادے پور بم دھماکوں کے ملزمین کو سخت سزا دینے اور بنگلہ دیش کے نام پر مسلم مزدور پیشہ افراد کو ناحق پریشان نہ کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ریاست میں سرکاری زبان اردو کے فروغ کی ضرورت

● سرینگر۔ 22 دسمبر، ریاست جموں وکشمیر کے نائب وزیر اعلیٰ تارا چند نے ریاست میں اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہونے کی بنا پر اس کے فروغ پر زور دیا ہے خاص کر تعلیمی اداروں میں اردو کو کم سے کم میٹرک تک لازمی مضمون قرار دینے کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے۔ اردو جہاں برصغیر ہندو پاک کی مہذب زبانوں میں شمار ہوتی ہے وہیں ریاست جموں وکشمیر میں اس زبان کو عام استعمال میں لایا جاتا ہے اور یہاں کے لوگ ریاست کے طول وعرض میں اس کو بولتے، سیکھتے اور اپناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو یہاں سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت تحریک آزادیِ کشمیر سے بہت پہلے سے حاصل تھی اور مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج کے دور میں بھی اردو کو سرکاری زبان کے طور پر دربار عام اور دربار خاص میں تسلیم کیا گیا تھا اور تمام خط و کتابت، دفتری کارروائیاں، نامہ و پیام یہاں تک کہ عدالتوں میں بھی اردو کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ برصغیر ہندو پاک کی تقسیم کے بعد بھی اردو کو ریاست جموں وکشمیر میں سرکاری حیثیت سے برقرار رکھا گیا اور مختلف عوامی رابطوں کے محکموں میں اس کو برابر استعمال میں لایا جاتا رہا۔ جموں وکشمیر بینک میں صارفین اور بینک حکام کے درمیان جو بھی کارروائیاں ہوتی رہی ہیں ان میں اردو زبان عام استعمال ہوتی رہی ہے۔ مگر اردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہونے کے باوجود اب کچھ عرصے سے اس کا انخلا تمام دفاتر سے منصوبہ بند طریقے سے مرحلہ وار ہو رہا ہے۔ اب اردو کی جگہ انگریزی اور ہندی کو دی جارہی ہے۔ اردو چونکہ مہذب سلیس اور میٹھی زبان ہونے کے علاوہ یہاں کے تمام لوگوں کے لیے آسانی سے سمجھنے والی زبان رہی ہے اس لیے ان کے لیے اس زبان میں سرکاری انتظامی مشینری اور نجی زندگی میں روابط، لین دین اور معاملات چلانا کافی آسان رہا ہے مگر اب اردو سرکاری انتظامیہ سے بے دخل کیے جانے کی کوششوں سے بہ روبہ زوال ہورہی ہے جس کی وجہ سے نجی زندگی میں بھی عام لوگ اردو زبان کو نہ چاہتے ہوئے بھی چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ حالانکہ اردو یہاں سماج و معاشرے کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ریاست کے نائب وزیر اعلیٰ تارا چند کی یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو ریاستی انتظامیہ میں ہر سطح پر فروغ دے کر محفوظ رکھا جائے۔ ان کا یہ کہنا کہ اسکولوں میں اردو کو کم سے کم میٹرک تک لازمی مضمون قرار دیا جائے اور اس کا کھویا ہوا مقام دوبارہ بحال کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے معقول ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ حکومت اردو کی سرکاری حیثیت کو بحال کرنے کے لیے اس کا پہلے کی طرح ہر محکمے میں استعمال لازمی قرار دے گی خاص کر نچلی عدالتوں، جموں وکشمیر بینک اور دیگر اس طرح کے عوامی روابط کے محکموں میں ساری کارروائی اردو زبان میں ہی تسلیم کی جائے تاکہ ریاست کی اس سرکاری زبان کی اصل حیثیت بحال رہ سکے اور اس کو ہر سطح پر فروغ ملے۔ (صحافت، دہلی)

طلبہ میں سخت محنت کا جذبہ ہونا ضروری

● علی گڑھ۔ 30 دسمبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قانون فیکلٹی کی لا سوسائٹی کے زیر اہتمام ''ٹیچنگ، ریسرچ اینڈ ورک کلچر'' موضوع پر منعقدہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جارج واشنگٹن لا اسکول امریکہ کے فیصل شروانی نے کہا کہ قانون کا پیشہ آج بھی دنیا کے سب سے باعزت پیشوں میں شمار کیا جاتا ہے ایک کامیاب قانون داں بننے کے لیے سخت محنت اور قربانی کے جذبے کا ہونا بہت ضروری ہے۔ فیصل شروانی نے قانون کے طلبہ سے کہا کہ وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ تحقیق پر بھی توجہ دیں کیونکہ تحقیق کے بعد ہی وہ خود

کو ایک ممتاز قانون داں کے طور پر متعارف کراسکتے ہیں۔ انھوں نے امریکہ کے لا اسکول میں قانونی تعلیم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں تحقیق پر کافی توجہ دی جاتی ہے اور اس کے لیے طلبہ 80 فیصد مواد خود تیار کرتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے فیصل شروانی نے طلبہ سے کہا کہ وہ موٹ کورٹس، قومی سیمینار اور بحث و مباحثہ کے مقابلوں میں سرگرمی کا مظاہرہ کریں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے کہا کہ ان کی کوشش ہے کہ یونیورسٹی کے ہر ایک شعبے میں معیاری تحقیقی کام ہو اور اس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہونے لگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غیر ممالک میں ریسرچ میں داخلہ حاصل کرنے والے اے ایم یو طلبہ کو غیر سرکاری تنظیموں سے مالی امداد مہیا کرانے کی سمت میں اے ایم یو انتظامیہ سنجیدہ کوششیں کر رہی ہے۔ انھوں نے فیصل شروانی کو ایک رول ماڈل قرار دیا۔ قانون فیکلٹی کے ڈین پروفیسر محمد شبیر نے کہا کہ طلبہ کو اپنا قیمتی وقت مکمل طور پر تعلیم کے لیے وقف کردینا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ جارج واشنگٹن لا اسکول کے ڈین بھی غالباً فروری 2010 میں تعلیمی تبادلے کے سمجھوتے کے تحت فیکلٹی کا دورہ کریں گے۔ شعبۂ قانون کے سربراہ پروفیسر آئی اے خاں نے حاضرین سے مہمان مقرر کا تعارف کرایا۔ پروگرام کے انعقاد میں لا سوسائٹی کے سکریٹری مصطفےٰ احمد، جوائنٹ سکریٹری توصیف رضا اور اراکین علی چودھری، حنا کوثر، عارف محمد، بہار الاسلام بھی موجود تھے۔ پروگرام میں طلبہ نے فیصل شروانی سے متعدد سوالات بھی دریافت کیے۔ (ہندستان ایکسپریس، دہلی)

غزل کا حسن مشاعروں میں نہیں کاغذ پر منحصر ہے

● رام پور۔ 23 دسمبر، رام پور رضا لائبریری کے سیمینار میں تشریف لائے انفرادی لب و لہجے کے شاعر فرحت احساس نے رام پور کے اہل ادب کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ بے تکلفانہ ماحول میں اردو شاعری، زبان و ادب، مشاعروں اور اردو تنظیموں کے بارے میں کھل کر بات ہوئی۔ فرحت احساس نے اس موقع پر ''ہمارا سماج'' سے بات کرتے ہوئے اردو صحافت کے کئی پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو اخبارات جہاں طباعت، کاغذ اور حسن ترتیب کے میدان میں کافی آگے آئے ہیں، وہیں زبان کی سطح پر اردو صحافت پر زوال آرہا ہے۔ اردو خبروں کو ہندی اخبارات کی طرز پر بنانے کا رواج شروع ہوگیا ہے، حالانکہ اردو کے ایسے اخبار جن کی باگ ڈور اہل علم و ادب کے ہاتھ میں ہے ہر ممکن احتیاط کرتے ہیں، لیکن علاقائی اردو صحافت مسلسل اپنی راہ سے بھٹک رہی ہے۔ شاعری پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج مشاعروں میں شاعروں کی نہیں باذوق سامعین کی کمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ شاعر مشاعروں پر چھانے اور داد لینے کے چکر میں ایسی شاعری کررہے ہیں، جس میں حالات حاضرہ کے واقعات اور اسلاف کے کارناموں کے حوالے سے سامعین کا خون گرمانے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ مشاعروں میں بھرپور داد مل سکے۔ انھوں نے کہا کہ اردو غزل، نظم وغیرہ کا حسن مشاعروں میں نہیں کاغذ پر منحصر ہے۔ فرحت احساس سے یہ گفتگو بزم اہل سخن کے صدر انتظام محمد شیر کی رہائش پر ہوئی، دوستوں کے اصرار پر فرحت احساس نے اپنی کئی غزلیں سنائیں اور رام پور کی نمائندگی کرتے ہوئے اظہر عنایتی، شاہد محمود خاں، سردار جاوید خاں، ڈاکٹر جاوید نسیمی و نوید قیصر نے اشعار سنائے۔

(ہمارا سماج، دہلی)

خطوط غالب کی ڈرامائی انداز میں پیشکش

● غالب اکادمی ہر سال مرزا اسداللہ خاں غالب کے یوم ولادت پر 27 دسمبر کو ایک جلسے کا انعقاد کرتی ہے۔ اس سال 212 ویں یوم ولادت کے موقع پر مشہور فنکار انیس اعظمی نے غالب کے خطوط کو ڈرامائی انداز میں پڑھا۔ انیس اعظمی نے غالب کے 1852 سے لے کر 1868 تک کے خطوط کو اس طرح پیش کیا کہ اس دور کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ انیس اعظمی نے منشی ہرگوپال تفتہ، تفضل حسین خاں، پیارے لال آشوب، گوبند سہائے، نواب امین الدین احمد خاں، میر مہدی مجروح، عزیزالدین، خواجہ غلام غوث خاں، بے خبر نبی بخش حقیر اور میر حبیب نواب کو لکھے گئے خطوط کو خط کے مزاج، اس دور کے تلفظ اور انداز کے مطابق اس طرح پیش کیا گویا الفاظ غالب کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔

اس موقع پر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ اردو دیوان کے علاوہ غالب کا ادبی سرمایہ ان کی فارسی شاعری اور اردو اور فارسی کے خطوط ہیں۔ خطوط کو غالب چھپوانا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کی زندگی میں ''عود ہندی'' اور ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ان کے خطوں کی اشاعت ہوگئی۔ غالب نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کی سچائی کو رقم کردیا ہے۔ ان کے خطوط سے ان کی سوانح بھی تیار کی گئی اور ان میں تاریخی پہلو بھی تلاش کیے گئے۔ غالب کی شاعری یا شخصیت سے جس نے رشتہ جوڑا وہ مقبول ہوا۔ انیس اعظمی نے غالب سے اپنا رشتہ ایک نئے طریقے سے جوڑا ہے۔ غالب کے خطوط کو ڈرامائی انداز میں انیس اعظمی جب بھی پڑھتے ہیں ان میں ایک نئی کیفیت اور تاثیر ہوتی ہے۔ اس موقع پر موجود اہم شخصیات میں خواجہ حسن ثانی نظامی، شجاع خاور، ڈاکٹر یونس جعفری، انجم عثمانی، انور علی قاسمی، نسیم عباسی، فضل بن اخلاق، راشد حسین، قمر سنبھلی، شہباز ندیم ضیائی، انور باری، ابرار کرت پوری، ذکیہ ظفر، محمد سلیم، منصور عثمانی، جے سی

بترا، وجے شرما کے نام شامل ہیں۔ محمد یوسف خان نظامی نے غالب کی فارسی نعت کے اشعار بھی پیش کیے۔ (ڈاک سے)

ابوالکلام قاسمی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

● نئی دہلی۔ 23 دسمبر، پروفیسر ابوالکلام قاسمی کو ان کی تنقیدی کتاب ''معاصر تنقیدی رویے'' پر ساہتیہ اکادمی اردو ایوارڈ 2009 کے لیے منتخب کیا گیا ہے جن کو اپنے تنقیدی شعور اور شفاف لسانی اظہار کے باعث گذشتہ 20 برسوں سے ہندوپاک میں بڑی توجہ اور انہماک سے پڑھا جاتا ہے۔ اردو تنقید کی روایت، معاصر تنقیدی منظرنامے اور نئے ادبی نظریات پر گہری نظر اور واقفیت رکھنے کے سبب تنقیدی فیصلوں میں وہ کبھی ابہام کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے نظری اور عملی تنقید دونوں میں اپنے امتیاز کو قائم رکھا ہے۔ ''تخلیقی تجربہ''، ''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت''، ''شاعری کی تنقید''، وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اگرہارا کرشن مورتی نے آج دہلی میں ایگزیکیٹو بورڈ کے اجلاس کے بعد ایک پریس کانفرنس میں 24 ہندوستانی زبانوں کے لیے اکادمی کے ادبی ایوارڈز کا اعلان کیا۔ اس ایوارڈ کے تحت ساہتیہ اکادمی کا امتیازی نشان اور 50 ہزار روپے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ ایوارڈ 16 فروری 2010 کو دہلی میں منعقد ہونے والی ساہتیہ اکادمی کی ایک پروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔ ایگزیکیٹو بورڈ کے اجلاس کی کارروائی ساہتیہ اکادمی کے صدر شری سنیل گنگوپادھیائے کی صدارت میں ہوئی۔ اجلاس میں اس سال یکم جنوری 2005 سے 31 دسمبر 2007 کے دوران پہلی بار شائع ہونے والی کتابیں زیرغور آئیں۔ ہندی میں کیلاش واجپئی کو ان کے شعری مجموعے ''ہوا میں ہستاکشر'' کے لیے، انگریزی میں چتر دیدی بدری ناتھ کو ان کی کتاب "The Mahabharata: An Inquiry in the Human Condition" کے لیے کشمیری میں مشعل سلطانپوری کو ان کی تنقیدی کتاب ''اونت'' کے لیے، پنجابی میں آتم جیت کو ان کی کتاب ''تتی توی دا سچ'' کے لیے، بنگالی میں سورین بھٹاچاریہ کو ان کی کتاب ''کینو آمرا ربندرا ناتھ کے چائی ابنگ کیبھابے'' کے لیے جبکہ راجستھانی میں میجر رتن جانگڑ کو ان کے افسانوں ''مائی ایڈوا پوت جنٹر'' کے لیے گجراتی میں سریش پنچال کو ان کی کتاب ''وات آپنا'' ''ویوچنی'' کے لیے اور کنڑ میں ویدیہی کو ان کے افسانوں ''کروچ پکشی گلو'' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں آسامی میں دروب جوتی بورا کو، بوڈو میں منورنجن لہاری (مرحوم) کو، ڈوگری میں پرادومن سنگھ جندراہیہ کو، کونکنی میں جیس فرنانڈز کو، میتھلی میں منموہن جھا (مرحوم) کو، ملیالم میں اوائے کھادر کو، منی پوری میں رگھولیشانگ تھیم کو، مراٹھی میں وسنت اباجی دہاکے کو، نیپالی میں سمیرن چھیتری پریادرشی کو، اوڑیا میں پھنی موہنتی کو، سنسکرت میں پراشسیہ مرا شاستری کو، سنتھالی میں دم یئتی بیشرا کو، سندھی میں آنند کھیمانی کو، تمل میں پوویاراسو کو اور تیلگو میں یارگلا گنڈا لکشمی پرساد کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اردو اکادمی کے سالانہ ایوارڈز 2008 کا اعلان
زاہدہ زیدی اور ساجدہ زیدی کو ''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ''

● نئی دہلی۔ 7 جنوری، طویل انتظار کے بعد آج آخرکار 2008 کے لیے اردو اکادمی دہلی کے سالانہ ایوارڈ اور کتابوں کے لیے انعامات کا اعلان کردیا گیا۔ اکادمی کا سب سے بڑا ایوارڈ ''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ'' ملک گیر سطح پر مجموعی ادبی خدمات کے لیے پروفیسر زاہدہ زیدی اور پروفیسر ساجدہ زیدی کو مشترکہ طور پر دینے کا اعلان کیا گیا ہے جو سگی بہنیں ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر مظفر حنفی کو پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔

اردو اکادمی دہلی کی اطلاع کے مطابق کل ہند سطح پر مجموعی ادبی خدمات کے لیے اردو اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز ''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ'' جو ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے (111111 روپے) پر مشتمل ہے مشترکہ طور پر پروفیسر زاہدہ زیدی اور پروفیسر ساجدہ زیدی کو دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ممتاز پروفیسر مظفر حنفی کو پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس ایوارڈ کی رقم مبلغ 51000 روپے ہے۔ اردو تحقیق و تنقید کا ایوارڈ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر کو، تخلیقی نثر کا ایوارڈ معروف فکشن نگار پروفیسر ابن کنول کو اور ترجمے کا ایوارڈ ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کے سابق استاد ڈاکٹر یونس جعفری کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ شاعری کے لیے اس مرتبہ دو ایوارڈ دیے جائیں گے۔ جن میں بھگوان داس اعجاز اور ڈاکٹر ظفر مرادآبادی شامل ہیں۔ اسی طرز پر اردو صحافت کے لیے بھی دو ایوارڈز دینے کا اعلان ہوا ہے۔ یہ ایوارڈ ریاض قدوائی اور ظفر آغا کو دیے جائیں گے۔ سائنسی ادب کا ایوارڈ ڈاکٹر اشہر قدیر کو دیا جائے۔ بہترین استاد کے لیے محترمہ ساجدہ قدیر اور محترمہ سیدہ کشور کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان ایوارڈز کے ناموں کا انتخاب سال 2008 کے لیے پروفیسر قمر رئیس مرحوم کی صدارت میں منعقد میٹنگ میں اردو اکادمی دہلی کی سابق ایگزیکیٹو کمیٹی نے کیا تھا۔ بعض دشواریوں کی بنا پر ان ایوارڈوں کا اعلان وقت پر نہیں کیا جاسکا تھا۔ گذشتہ دنوں اکادمی کی گورننگ کونسل کی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ اور چیئر پرسن اردو اکادمی شیلا دکشت نے مرحوم قمر رئیس کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے ان ایوارڈز کی توثیق کردی تھی۔ پروفیسر قمر رئیس مرحوم کی زندگی میں ہی

2008 کے لیے کتابوں پر طے شدہ انعامات کا اعلان بھی آج کر دیا گیا۔

2008 کے لیے کتابوں پر جو انعامات دیے گئے ہیں ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر عبدالرشید کو ان کی کتاب ''فرہنگِ کلامِ میر'' پر گیارہ ہزار روپے کا خصوصی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محمود ہاشمی کو (جن کا انتقال گذشتہ سال ہوگیا) ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''انبوہِ زوال پرستاں'' پر سات ہزار ایک سو روپے کا انعام دیا گیا ہے۔ محترمہ ترنم ریاض کے افسانوں کے مجموعے ''میرا رختِ سفر''، ڈاکٹر ناصرہ شرما کے ناول ''شال ملی''، اسد رضا کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل مجموعے ''ادبی اسپتال''، ڈاکٹر جی. آر. کنول مجموعۂ کلام ''نیند کیوں نہیں آتی'' اور ڈاکٹر عمیر رضا کے تحقیقی مطالعے ''علی سردار جعفری'' کے لیے سات ہزار ایک سو روپے کے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے جبکہ پانچ ہزار ایک سو روپے کے انعام کے لیے چھ کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر تابش مہدی کا حمد، نعت اور منقبت کا مجموعہ ''صبح صادق''، ڈاکٹر عظیم امروہوی کا مجموعۂ کلام ''میرے خوابوں کا جہاں''، ڈاکٹر مجیب احمد خاں کی تحقیقی کتاب ''قرۃ العین حیدر''، اکرام الحق کی ''ایک کمرہ سارا جہاں''، جناب ظفر عدیم کا ناول ''یاسمین'' اور ڈاکٹر معصوم رضا کی کتاب ''تذکرۂ سادات عشری'' شامل ہیں۔ تقسیم انعامات کا جلسہ 6 فروری 2010 کو شام پانچ بجے اردو اکادمی، دہلی کے ''قمر رئیس سلور جوبلی'' آڈیٹوریم میں منعقد کیا جائے گا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

گیانی ذیل سنگھ میموریل لٹریری ایوارڈس

● نئی دہلی۔ وشوکرما رام گڑھیا کلب کی جانب سے ہندی، اردو اور پنجابی کے شعرا کو سال 07-2006 اور 08-2007 کے گیانی ذیل سنگھ میموریل لٹریری ایوارڈ پیش کیے گئے۔ اعزازات انڈیا انٹرنیشنل سینٹر انیکسی میں ممتاز دانشور اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بدست تفویض کیے گئے۔ سال 07-2006 کے ایوارڈ رجنا اگروال (ہندی)، نظمی سکندر آبادی، (اردو) اور بھگوان سنگھ دیپک (پنجابی) کو دیے گئے جبکہ 08-2007 کے لیے جن شعرا کو نوازا گیا، ان میں ہندی سے شرون راہی (پس مرگ)، اردو سے پریم بہاری لال سکسینہ رواں اور پنجابی سے منویر سنگھ بترا کے نام شامل ہیں۔ ایوارڈس کے تحت مومنٹو، شال اور نقد رقم پیش کی گئی۔

مہمان خصوصی کے طور پر اپنی تقریر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو، ہندی اور پنجابی زبانوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے۔ پنجابی ایسی زبان ہے جس نے عشق کا ایک ایسا لافانی تصور دیا جس سے ساری زبانیں سیراب ہوئیں اور اردو کو مختلف زبانوں میں وہی حیثیت حاصل ہے جو عمارات میں تاج محل کو حاصل ہے۔ مہمان اعزازی ستیندر سنگھ نے گیانی ذیل سنگھ کی شعروادب سے رغبت کا تذکرہ کیا۔ اردو کی اہمیت بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اردو کا طاقت ور ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے کئی چیزیں جڑی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر سید ظفر محمود نے کلب اور اس کے صدر نرمل سنگھ نرمل رائے پوری کی قومی یکجہتی اور مذہبی ہم آہنگی کے لیے کی جانے والی خدمات کی ستائش کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جموں: انتر راشٹریہ ستاہن اُپادھی سنستھان کی طرف سے اردو کے مشہور ادیب جناب آنند لہر کو ''ساہتیہ سمن'' ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ شری آنند لہر کو اُن کے ادبی کارناموں کے لیے دیا گیا۔ شری آنند لہر نے اردو میں گیارہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تخلیقات کا انگریزی، ہندی، ڈوگری اور کشمیری میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ انھیں اس سے پہلے بہار اردو اکادمی، راجستھان اردو اکادمی، اترپردیش اردو اکادمی کے علاوہ میر اکادمی لکھنؤ، امریکن بایوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ''مین آف دی ایئر'' اور پراچین کلا کیندر چنڈی گڑھ کے انعام بھی مل چکے ہیں۔ (ڈاک سے)

مجتبیٰ حسین کو صدمہ

● حیدرآباد۔ معروف و بزرگ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے بڑے داماد غلام صمدانی کا 56 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم صمدانی حج پر گئے ہوئے تھے اور شوگر کے مریض تھے۔ انتقال آج صبح مکہ معظمہ میں ہوا۔ نماز جنازہ مسجد الحرام میں ادا کی گئی اور تدفین جنت الشرعیہ میں ہوئی۔ پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔

مختصرات

● سی۔ عبدالحکیم کالج، میل وشارم، تمل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا سینٹر قائم ہے جہاں اردو ڈپلوما کورس، عربی سرٹیفکیٹ کورس اور عربی ڈپلوما کورس کی تعلیم جاری ہے۔ امسال 152 طلبہ و طالبات نے کورس مکمل کرکے اسناد حاصل کیں۔ اس سلسلے میں ایک جلسہ 7 نومبر 2009 کالج آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا تھا۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک اور نعت شریف سے ہوا۔ جناب محی الدین حسینی صاحب استاد این.سی.پی.یو.ایل نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ جناب پروفیسر ایس محمد یاسر، صدر شعبۂ اردو نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ جناب ایس. زیڈ. ابرار احمد نے جلسے کی صدارت کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر این.ایم. محمد طٰہٰ صاحب نے جلسے سے خطاب فرمایا اور مہمان اعزازی ڈاکٹر قاضی حبیب احمد صاحب نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ایس محمد

یوسف صاحب، کالج پرنسپل نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ صدر جلسہ جناب ایس. زیڈ. ابرار احمد نے کامیاب طلبہ و طالبات کو اسناد تقسیم کیے۔ جلسے میں عمائدین شہر اور اخبارات و رسائل اور الیکٹرانک میڈیا کے نامہ نگاروں کی خاصی تعداد بھی شامل تھی۔ اراکین انتظامیہ میں سے الحاج انیس احمد صاحب اور الحاج کے انیس احمد صاحب رکن کالج کمیٹی شریک جلسہ رہے۔ جناب ٹی شفیق احمد کے ہدیہ تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

● 11 نومبر کا دن ہمارے ملک میں قومی یوم تعلیم کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دن مولانا آزاد کے یوم پیدائش کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد ایجوکیشنل اکادمی آمبور کی جانب سے 14.11.2009 کو ''مولانا آزاد۔ ایک عظیم شخصیت'' کے موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا۔ مذاکرے کا آغاز حافظ رحمت اللہ صاحب کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ مولانا آزاد ایجوکیشنل اکادمی کے مینجنگ ڈائرکٹر بی. اشرف علی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ٹی. تنویر احمد نے اکادمی کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آزاد اکادمی کی جانب سے دسویں اور بارھویں جماعت کے طلبہ کو سرکاری امتحانات میں اعلیٰ نمبرات میں کامیاب ہونے کے لیے خصوصی کوچنگ اسکالرشپ کی رہبری اور کمپیوٹر کی تعلیم وغیرہ کا انتظام گذشتہ تین سالوں سے انجام دیا جارہا ہے۔

سیمینار کی صدارت پروفیسر قاضی حبیب احمد (شعبہ اردو، عربک اور پرشین، مدراس یونیورسٹی) نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر وانمباڑی حلقے کے ایم. ایل. اے. اچ عبدالباسط صاحب نے شرکت فرما کر مولانا آزاد ایک عظیم شخصیت کے عنوان پر تقریر کی اور مقالہ نگاروں کو انعامات اور اسناد سے نوازا۔ آمبور اہل سنت والجماعت کے صدر منیگار خلیل الرحمٰن صاحب، باگئی حیات باشاہ صاحب اسکول کے میر مدرس فضل اللہ صاحب، محمد اسماعیل عبدالسبحان صاحب، سید نصر الدین، جنتر رفیق احمد صاحب وغیرہ حضرات مہمان اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ حسب ذیل حضرات نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر کلیم اللہ، پروفیسر سعید الدین، پروفیسر یاسر، پروفیسر فیاض، پروفیسر وصی اللہ، مولوی عرفان احمد، محمد مسلم صاحب، فضل اللہ صاحب انتر جامی، جناب نصر اللہ شاہ صاحب، جناب مالک باشاہ صاحب، سردار باشاہ صاحب، خالد احمد صاحب، دسویں اور بارھویں جماعت کے سہ ماہی امتحان میں کامیاب ہوئے طلبہ و طالبات کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ (ڈاک سے)

● مدراس (تملناڈو): یکم نومبر اتوار کی شام اردو اکادمی (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام ''یوم اردو'' منایا گیا۔ صدارت ڈاکٹر سید محمد ابراہیم، مدراس نے کی۔ مولانا محمد اسحاق عابد نے کلام پاک کی تلاوت سے جلسے کا آغاز کیا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر ظہیر آفاق نے استقبالیہ کلمات میں اردو تعلیم کی توسیع و ترقی پر زور دیا۔ صدر محترم نے فرمایا کہ عربی مدرسوں میں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم بھی دی جائے۔ عربی اساتذہ کو چاہیے کہ اردو کی تعلیم کو بھی فروغ دیں اور اس تحریک کو پورے عزم کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ ڈاکٹر ظہیر آفاق نے کہا کہ پہلے شہر مدراس کی جن مساجد میں عربی تعلیم دی جارہی ہے وہاں کے انتظامیہ سے گزارش کریں کہ عربی کے ساتھ اردو تعلیم کا بھی اہتمام کریں۔ اس کے لیے اردو اکادمی رجسٹرڈ بھرپور تعاون کرے گی۔ غیر طرحی مشاعرہ بھی ہوا۔ جس میں مولانا محمد اسحاق عابد، وہاب نازش، ماہر مدراسی، صدا آمری، اقبال محی الدین مومن حکیم محمود علی محمود اور ڈاکٹر ظہیر آفاق نے اپنے اپنے کلام سے محفل کی رونق بڑھائی۔ رفیق سعیدی نے اپنا تازہ افسانہ ''تلافی'' پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● ناگپور۔ یونائیٹڈ اسٹوڈینٹس ایسوی ایشن ناگپور کے زیر اہتمام مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر ایک تقریب مائنارٹیز سیوا مجلس کے صدر جناب صدیق علی خاں پٹیل کی صدارت میں منعقد کی گئی جس میں رکن پارلیمان جناب ولاس متموار، جناب ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی، جناب ڈاکٹر راجو دیوگھرے مہمان اعزازی کے طور پر موجود تھے۔ جلسے کا آغاز تلاوت کلام ربانی سے ادارے کے سکریٹری انعام الرحیم نے کیا اور بارگاہ رسالت مآب میں نعت پاک کا نذرانہ تنویر احمد کشمیری نے پیش کیا۔ مہمانوں کا استقبال رکن بلدیہ سراج احمد نے کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں جاوید احمد انصاری نے مولانا آزادؔ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد کو جدید ہندوستان کا معمار کہا۔ اس موقع پر تعلیم، ادب، صحافت، فن مصوری، اداکاری اور اسپورٹس جیسے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی 15 شخصیات کو مولانا آزاد ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں ایڈوکیٹ فہیم الدین صاحب کو ''مولانا آزاد صحافتی ایوارڈ''، فیروز علی حیدری صاحب کو ''مولانا آزاد ادبی ایوارڈ''، الماس ناظم سعید، ماسٹر عبدالستار، ماسٹر نعیم اختر انصاری، ماسٹر عبدالغفور اور ماسٹر سعید ایاز کو ''مولانا آزاد تعلیمی ایوارڈ'' کے علاوہ شارق پٹیل، ایڈوکیٹ نوشاد علی حیدری، ابراہیم بخش آزاد، مصطفےٰ منیر، بابر شریف، طٰہٰ منیب، محمد رضوان اور فضل الرحمٰن قریشی کو ''مولانا آزاد یوتھ ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

صدر جلسہ جناب صدیق علی خاں پٹیل نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا آزاد جہاں ایک پائے کے عالم دین تھے، ایک جلیل القدر سیاسی رہبر بھی تھے۔ ایشیا کے نامور ماہرین تعلیم میں آپ کا نام وقت کے مورخ کو سرفہرست رکھنا ہوگا۔ آپ کی دوراندیشی نے مادی و روحانی تناظر میں دینی و عصری علوم کا جو نظام تعلیم ہندوستان کو دیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں بھی دور حاضر کے ماہرین تعلیم نے اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے۔

اس موقع پر مہمانان خصوصی ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، شبیر احمد

دوروهی، الحاج محمد ظفر حیات، ماسٹر محمد نظیر الدین، حاجی مشتاق احمد قدوائی، محمد غلام رسول اشرف، محمد حسن بھائی، مولانا عمران اختر ندوی، انصاری اصغر جمیل، عبدالکریم پٹیل (سی اے)، حاجی محمد ظہیر انصاری محمد مشتاق منصوری، ریاض العلیم خان، ماسٹر شیخ یوسف، محمد انور جلیل وغیرہ موجود تھے۔ نظامت کے فرائض محمد نظام الدین انصاری نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش کی مناسبت سے صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام تقاریب یوم تعلیم کا انعقاد عمل میں آیا۔ مولانا آزاد کی حیات و خدمات پر مشتمل مختلف پروگرام ہوئے جن میں سیمینار، کوئز، تحریری و تقریری مقابلے، توسیعی لکچر کے علاوہ معلوماتی نمائش ترتیب دی گئی جس میں مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف گوشوں کو تصاویر اور چارٹس کے ذریعے پیش کیا گیا، تقاریب زیر صدارت مولانا خلیل احمد ندوی نظامی چیئرمین صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی منعقد ہوئی۔ مہمانان خصوصی میں پروفیسر افشار عالم، جناب لعل جان پاشاہ ایم پی، مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی، جناب زاہد علی خان ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد، غوث خواہ مخواہ اور جناب اسلم فرشوری وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ محمد انور الدین صدیقی انچارج صمدانی NCPUL کمپیوٹر سنٹر نے رپورٹ پیش کی۔ مقررین نے کہا کہ دنیا میں بہت کم قائدین ایسے گزرے ہیں جن کو مذہب اور سیاست دونوں میں قائد مانا جاتا ہے، ان گنی چنی ہستیوں میں ایک شخصیت مولانا آزاد کی ہے جن کو دینی بصیرت کے ساتھ سیاسی فراست کا بھی وافر حصہ ملا تھا، مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ان کے اسلوب تحریر کی کشش، مضامین کی افادیت ہر پڑھنے والے کو گرویدہ بنا لیتی، مولانا کو خطابت میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں جرأت مندی کے ساتھ حصہ لیا اور دس سال آہنی سلاخوں کے پیچھے گزارے۔ انھوں نے آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے کئی شعبوں کو ترقی دی۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی میں ملک کی ہمہ جہتی ترقی مولانا کی ابتدائی منصوبہ بندی کا ہی نتیجہ ہے۔ توفیق احمد نے تعارفی تقریر کی، حافظ شیخ عبدالشکور کنوینر تقاریب نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● شعبۂ اردو بی آر اے بہار یونیورسٹی مظفر پور نے بہار اردو اکادمی پٹنہ کے تعاون سے 11 اور 12 نومبر 2009 کو دو روزہ سیمینار کا انعقاد کیا۔ افتتاح یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر راج دیو پرساد سنگھ نے کیا اور افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر نجم الہدیٰ نے فرمائی۔ پروفیسر ابومنور گیلانی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر ڈاکٹر این کے یادو نے بھی خطاب کیا۔ یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر ڈاکٹر این کے یادو نے بھی خطاب کیا۔

پروفیسر نجم الہدیٰ نے صدارتی خطبے میں کہا کہ وہ قادری صاحب کے شاگردوں میں رہے ہیں۔ اختر قادری صاحب قادرالکلام شاعر، مشفق استاد اور ایک بہترین انسان تھے۔ سیمینار کا دوسرا سیشن دو بجے دن میں شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے فرمائی۔ پانچ مقالے پڑھے گئے۔ پروفیسر ظفر حبیب (بیگوسرائے)، پروفیسر محمد ضیاء الدین (پٹنہ)، اور ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد (آرہ) نے اختر قادری کی شاعری پر مقالات پڑھے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے شین مظفر پوری کی طنز نگاری پر اور ڈاکٹر مظفر اعجاز نے ''شین مظفر پوری کے افسانوں پر اظہار کیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے صدارتی تقریر میں شین صاحب اور اختر قادری سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا۔ سیمینار کے دوسرے دن پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر عبدالواسع نے فرمائی اور پانچ مقالے پڑھے گئے۔ پروفیسر ناز قادری نے اختر قادری کی نظمیہ شاعری پر، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے شین مظفر پوری کی تصنیف ''رقصِ بسمل'' پر مقالات پڑھے۔ ڈاکٹر محمد شاکر (مظفر پور) ڈاکٹر حافظ انیس صدری (سمستی پور)، ڈاکٹر محبوب اقبال، اور ثریا جہاں صاحبہ (ریسرچ اسکالر) نے شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری پر مقالے پیش کیے۔ صدر مجلس نے کہا کہ یوں تو سب مقالے عمدہ تھے لیکن ثریا جہاں صاحبہ کا مقالہ سب سے اچھا تھا۔ انھوں نے ایسے سیمیناروں کے بار بار انعقاد پر زور دیا کہ اس سے طلبہ ریسرچ اسکالروں اور اساتذہ کی تربیت ہوتی ہے۔

12 نومبر کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم احمد مظفر پور نے فرمائی۔ پانچ مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ پروفیسر عبدالواسع نے پڑھا۔ دوسرا نجم الہدیٰ صاحب نے جن کا موضوع اختر قادری کی شاعری تھی۔ تیسرا مقالہ پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری پر پیش کیا۔ ان کے علاوہ دو ریسرچ اسکالروں تنویر احمد صدیقی اور محمد صباء الہدیٰ صبا نے بھی شین مظفر پور کی افسانہ نگاری پر مقالات پیش کیے۔

صدارتی تقریر میں پروفیسر شمیم احمد نے فرمایا کہ جو مقالے دو دن میں پڑھے گئے سب اہم ہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ بہار اردو اکادی اور یونیورسٹی مظفر پور مل کر ان مقالات کو کتابی صورت میں شائع کرائیں۔ (ڈاک سے)

● ممبئی۔ 3 دسمبر کو شام 7 بجے ''اردو خبرنامہ'' کے زیر اہتمام لندن سے آئے معروف افسانہ اور ناول نگار جتیندر بلو کے اعزاز میں ایک غیر رسمی تقریب منعقد کی گئی۔ پروفیسر الیاس شوقی نے جتیندر بلو کا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ بلو کے افسانے 1960 کے وسط ہی سے رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ ان دنوں بلو ممبئی ہی میں مقیم تھے۔ 1973 میں فکر معاش انھیں لندن لے گئی اور وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بلو کا پہلا افسانوں کا مجموعہ ''پہچان کی

لوک پر'' 1986 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد بالترتیب ''جزیرہ''، ''نئے دیش میں''، ''انجانا کھیل'' اور ''چکر'' منظرِ عام پر آئے۔ ناولوں میں ''پرائی دھرتی اپنے لوگ''، ''مہانگر'' اور ''وشواس گھات'' کو بے حد مقبولیت ملی ہے۔

انور قمر نے بلّو کے افسانوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بلّو کے افسانوں میں ہندوستانی اور مغربی تہذیب کا تصادم جا بجا دکھائی پڑتا ہے۔ انھوں نے لندن میں بسے ہندوستانیوں کے کرب کو اپنے افسانوں میں پوری شدّت سے روشن کیا ہے۔ ساگر سرحدی نے کہا کہ بلّو کے لندن جانے سے پہلے ہم دونوں اکثر شامیں چرچ گیٹ پر ایک ساتھ گزارا کرتے تھے۔ میں جب لندن گیا تو بلّو اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ ہی گزارتے تھے۔ یہ ان کی دوست نوازی تھی۔ اسلم خان نے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہے کہ گزشتہ دس دنوں میں بلّو کے لیے یہ تیسری نشست منعقد کی گئی ہے۔ پہلی نشست کھپولی (رائے گڑھ) دوسری میرا روڈ اور اب یہ تیسری ''اردو خبرنامہ'' کے زیرِ اہتمام کرلا میں منعقد ہوئی ہے۔ اس سے بلّو کی ہر دلعزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ سید ریاض رحیم نے بلّو سے ہندوستان اور لندن کی تہذیب، طور طریقے اور رہن سہن کے تعلق سے کئی سوالات کیے نیز افسانوں اور ناولوں میں تجریدیت، علامیت اور ابہام پر سوال اٹھایا کہ آیا افسانوں اور ناولوں سے قاری کی دوری کا سبب یہی ہے؟

جتندر بلّو نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ستر کی دہائی میں ہم بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے تھے۔ اور ہم نے بھی تجریدی اور علامتی افسانے لکھے۔ لیکن اب وہ اس بدعت سے تائب ہو کر بیانیہ کی پناہ میں آ گئے ہیں۔

رمضان علی سحر نے جتیندر بلّو کو شال اور پھول پیش کر کے اعزاز دیا۔ ان کے علاوہ ساگر سرحدی، انور قمر اور الیاس شوقی کی خدمت میں بھی گلدستے پیش کیے گئے۔ آخر میں ''اردو خبرنامہ'' کے مدیر اشتیاق سعید نے جتیندر بلّو، ساگر سرحدی اور انور قمر کے ساتھ ساتھ تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

بجھ گئی دل کی روشنی راہ دھواں دھواں ہوئی
صبح چلے کہاں سے تھے شام ہمیں کہاں ہوئی

مخمور سعیدی

● نئی دہلی۔ 21 دسمبر، اردو اکادمی، دہلی میں سیمینار کے بعد ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف حصوں سے آنے والے شاعروں اور شاعرات نے حصہ لیا۔ چونکہ سیمینار ''اردو غزل'' پر منعقد کیا گیا تھا لہٰذا تمام شعرائے کرام نے اس پروگرام میں صرف اپنی غزلیں سنائیں۔ اس مشاعرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف وہی منتخب شعرا شریک ہوئے جن کی غزلیں تواتر کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مشاعرہ چھ بجے شام کو شروع ہوا اور اس کا اختتام رات دس بجے ہوا۔ سیمینار کی طرز پر اس مشاعرے کی باضابطہ مجلس صدارت قائم کی گئی تھی جس میں پروفیسر عتیق اللہ، بشر نواز اور پاکستان سے تشریف لائی شاعرہ فاطمہ حسن اور مشہور فکشن نگار محترمہ زاہدہ حنا تشریف فرما تھیں۔ نظامت کے فرائض شعیب رضا فاطمی نے انجام دیے۔ ذیل میں چند اشعار درج کیے جا رہے ہیں:

وصال پا گئے سب مرشدانِ کوئے جنوں
ملال یہ ہے کہ دہلیز عاشقاں بھی گئی

زبیر رضوی

یہی چہرہ یہی آنکھیں یہی رنگت نکلے
جب کوئی خواب تراشوں تیری مورت نکلے

بشر نواز

تمام لفظ و معانی پگھلتے جاتے ہیں
کہ مجھ پہ چھایا ہے ایک لمحۂ عجب خاموش

خلیل مامون

میرے چراغ کو طاقِ زیاں پہ رکھتا ہے
جہاں اندھیرا نہیں ہے وہاں پہ رکھتا ہے

فرید پربتی

خموشیوں کو رکھا ہے مزاج میں شامل
ہم اس طرح بھی ہوئے احتجاج میں شامل

شاہد میر

بڑا نادان ہے بہکا ہوا ہے
یہ بندہ خلد کا بگڑا ہوا ہے

خالد محمود

عجب بلا کا تصرف تھا خواب پر اس کا
کھلی جو آنکھ تو پہروں رہا اثر اس کا

احمد محفوظ

مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کر دیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے قدم سفر کی طرف

شہپر رسول

وہی قطرہ جو کبھی کنجِ سرِ چشم میں تھا
اب جو پھیلا ہے تو سیلاب ہوا جاتا ہے

کوثر مظہری

ہزاروں تارے ہیں تیری ہتھیلیوں میں مگر
تو میرے گھر سے مگر چاند کیوں چراتا ہے
شائستہ یوسف

مجھے حالات نے مہلت نہیں دی
میں ٹوٹا گھر بنانا چاہتا تھا
شعیب رضا فاطمی

کوئی رہبر نہیں ملتا کوئی رہزن نہیں ملتا
ہمیشہ ہمسفر میری یہ گرد کارواں کیوں ہو
نسیم انصاری

ہماری راہ میں ہے گرچہ کوفہ اور فرات
پکارتا ہے مگر شہر الف لیلا بھی
سلیم شہزاد

ان کے علاوہ فاطمہ حسن (پاکستان)، عالم خورشید، فاروق بخشی، عنبر بہرائچی، پروفیسر صادق، مہتاب حیدر نقوی، فرحت احساس، بلقیس ظفیر الحسن، شاہد ماہلی، ایاز رسول نازکی، قاسم خورشید نے بھی اپنا اپنا کلام سنایا۔
(اخبار مشرق، دہلی)

فرشتو آؤ مری درس گاہ میں بیٹھو
بیان رتبہ انسان کرنا چاہتا ہوں
شمس رمزی

● نئی دہلی۔ 16 دسمبر، انجمن فروغ اردو دہلی کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرہ غالب اکادمی میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت معین اختر انصاری نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر آل انڈیا حج کمیٹی کے چیئرمین حسن احمد نے شرکت کی۔ افتتاح راجیند ر گپتا نے کیا۔ شمع مشاعرہ ذاکر حسین منصوری نے روشن کی۔ نظامت فاخر ادیب نے کی۔ پیش ہیں منتخب اشعار۔

جو میرے شانوں پہ روشن ہے میرا اپنا ہے
یہ چہرہ میں نے کسی اور سے خریدا نہیں
شہناز ندیم ضیائی

اسے بھی شہ نے مصاحب بنا لیا اپنا
اک آدمی سے توقع تھی لب کشائی کی
اقبال اشہر

ستا کے ہنس لو مگر میرا مشورہ سن لو
مرے نشانے پہ آنے کی بھول مت کرنا
عادل رشید

یہ شہر رہا ہوگا شائستہ مزاجوں کا
اس شہر کے ملبے سے گلدان نکلتے ہیں
معین شاداب

گھر سے نکل کے ذہن کو آرام مل گیا
سورج کی تیز دھوپ میں جب کام مل گیا
میکش امروہوی

شکست دل کی ہوئی، دل نے حوصلہ چھوڑا
تصورات نے کب کوئی سلسلہ چھوڑا
سلمیٰ شاہین

منافقوں کی بہت ہی طویل تھی فہرست
جو خود کو پرکھا تو اک نام اور ابھر آیا
سلیم کاشف

جب سے گھر کو بانٹا ہے
دونوں طرف سناٹا ہے
سلیم حیدر امروہوی

کہیں مجھے مری منزل نظر نہیں آتی
ہزاروں سال سے دن رات چل رہا ہوں میں
ثمر نور پوری

وہیں وہیں پہ مقرر ہیں وقت کے رہزن
مرے نشاں ہیں ابھی تک جہاں جہاں باقی
عارف خانپوری

بچھڑتے ہی کسی سے ہوگیا احساس یہ ہم کو
کہ رستہ کس طرح اک میل کا سو میل ہوتا ہے
وسیم نادر نگرالوی

جلنے والوں کی آنکھوں میں
آخر اتنا پانی کیوں ہے
سویتا اسیم

ان کے علاوہ عظمیٰ اختر، فرمان چودھری، ساجد حسنپوری اور اشرف نانپاروی نے بھی کلام پڑھا۔ (صحافت، دہلی)

الٰہی تو مجھے خورشید کی فطرت عطا کردے
سہاروں سے اگر چمکوں مجھے اچھا نہیں لگتا

نئی دہلی۔ 22 دسمبر، عالمی اردو ٹرسٹ اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے ایوان غالب میں ہندنژاد شاعر، ادیب اور صحافی ''صدا'' (لندن) کے مدیر اقبال مرزا کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا جس کی صدارت گلزار

زتشی دہلوی نے کی اور نظامت کے فرائض محترمہ شاہینہ نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز برنی اور پنجابی ادیب ڈاکٹر مہیب سنگھ شریک ہوئے۔ پیش ہے شعرا کے کلام کا نمونہ:

گلزار آبروئے زباں اب ہمیں سے ہے
دلّی میں اپنے بعد یہ مطلب سخن کہاں
گلزار دہلوی

ہم تو مستقبل کی خاطر جب بھی سنجیدہ ہوئے
زندگی کے مسئلے کچھ اور پیچیدہ ہوئے
شہباز ندیم

بسی ہوئی ہے یہ کیسی خوشبو مجھ میں
شاید آ کر بیٹھ گیا ہے تو مجھ میں
شمس رمزی

کچھ دور ساتھ ہم بھی چلے تھے کہ یوں ہوا
کچھ مسئلوں پہ ان سے طبیعت نہیں ملی
شاہد ماہلی

یہ شہر رہا ہوگا شائستہ مزاجوں کا
اس شہر کے ملبے سے گلدان نکلتے ہیں
معین شاداب

آندھی چلے چمن میں کہ باد صبا چلے
میں وہ دیا ہوں دوشِ ہوا پر سدا چلے
متین امروہوی

ان پرندوں کو تو یہ شاخ سہارا دے خدا
جو زبانوں سے تری حمد و ثنا کہنے کو ہیں
ایم آر قاسمی

میرے بچپن کے خواب کی تعبیر لے کر آئی ہے
آج کھانے کے لیے وہ کھیر لے کر آئی ہے
اقبال فردوسی

زباں پر نام تیرا آ گیا تھا
مرا لہجہ نشیلا ہو گیا ہے
جاوید مشیری

ہمارے شہر کی خاموشیاں نرالی ہیں
سکون بخش ہیں چہرے مگر سوالی ہیں
شاہد انور

ثابت قدم رکھا مجھے عزمِ صمیم نے
تم نے میرے خلاف کیے فیصلے بہت
وارث وارثی

تمھارے چہرے پہ اکثر چمکنے والا رنگ
تمھیں خبر ہے کئی راز دل کے کھولتا ہے
سلیم صدیقی

امید، آس بھری چٹھیاں بھی رکھی ہیں
سنگار میز پہ کچھ چوڑیاں بھی رکھی ہیں
وسیم راشد

ماں خطاؤں پہ ڈانٹ دیتی ہے
دل سے کہتی نہیں برا مجھ کو
عرفان طالب

مشاعرے کے اختتام پر کنوینر پروگرام فاروق ارگلی نے سامعین و شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ ٹرسٹ کے بانی اے رحمان اور عزیز برنی نے بھی شعرا کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ (صحافت، دہلی)

بیچے جائیں گے جھوٹی خبروں پہ لوگ
یہی ایک سچی خبر ہے یہاں

شیدائے ادب متھرا کے زیر اہتمام ادبی دنیا کے ممتاز شاعر و ناظم پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی متھرا آمد پر ایک شام پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے نام کے عنوان سے محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت دل تاج محلی نے فرمائی۔ بحیثیت مہمانِ خصوصی دہلی سے تشریف لائے بزرگ شاعر جناب مخمور سعیدی نے شرکت کی۔ شمع افروزی ڈاکٹر عرفان جمالی نے کی۔ نظامت کے فرائض بزمِ شیدائے ادب کے نائب صدر مشرف حسین محضر نے انجام دیے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بابائے اردو کا خطاب پیش کیا گیا اور مخمور سعیدی کو وقارِ اردو کے خطاب سے نوازا گیا۔ ملک زادہ منظور احمد نے بزم شیدائے ادب کی کارکردگیوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے اس اردو کش دور میں بزم کی کارکردگی کو ادبی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ مشاعرے کا آغاز ہدیہ نعت سے ڈاکٹر عرفان جمالی نے کیا۔ چند اشعار باذوق قارئین کی نذر ہیں۔

شادمانی کی سحر ہو یا کہ شام غم رہے
اپنا ہی عالم رہے گا کوئی بھی عالم رہے
دل تاج محلی

اس کی گلی سے مقتلِ جاں تک سحر سے میخانے تک
الجھن پیاس خلش تنہائی کرب زدہ لمحات کے نام
پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

بِچھے جائیں گے جھوٹی خبروں پہ لوگ
یہی ایک بچی خبر ہے یہاں
مخمور سعیدی

کبھی زیاں تو کبھی برتری کا رشتہ ہے
بڑا عجیب میری زندگی کا رشتہ ہے
سعید اعظمی

ہمیں سکھائیں گے آداب زندگی تم کو
ہمیں بجھائیں گے اک روز نفرتوں کے چراغ
مشرف حسین محضر

کہنہ مشقی ہی حسیں شعر کی ضامن تو نہیں
شاخِ کہنہ پہ بمشکل گلِ تر لگتا ہے
عرفان جمالی

دیکھی ہیں جب سے میں نے انسانیت کی لاشیں
میرا قلم تڑپ کر تلوار ہوگیا ہے
سرور مارہروی

شاگرد ہوں میں میر و غالب و مومن کا اے لوگو
میں اُن کو ہر صدی کا رہنما تسلیم کرتا ہوں
حاجی محمد احمد خاں تابش

صاحب ظرف ہیں جو اے اشہر
لاکھ غم ہوں وہ ہنسا کرتے ہیں
شاکر علی اشہر

قربان تجھ پہ کردیں متاعِ حیات ہم
لیکن تری نظر کا اشارہ ملے گا کب
اسلام مظفرآوی

گلپوشی اب تو اے لوگو جان کی لیوا ہوتی ہے
اب کیا ہے ضرورت مخبر کی اب پھولوں میں بم ہوتا ہے
صدیق راز

وقائع مسافرت

● نئی دہلی۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آج نائب صدر جمہوریہ کی رہائش گاہ کے کانفرنس ہال میں منعقد ایک پروقار تقریب کے دوران ڈاکٹر عمر خالدی اور ڈاکٹر سنیل شرما کی تصنیف کردہ کتاب ''وقائع مسافرت: میر لائق علی خان عماد السلطنۃ سالار جنگ دوئم'' کا اجرا نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس پروگرام کی نظامت مولانا عطا اللہ قاسمی نے کی۔ اس فارسی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے محمد حامد انصاری نے کہا کہ دنیا میں اسفار ہوتے رہے ہیں اور سفرنامے بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے عرب سیاحوں بالخصوص ابن بطوطہ کا ذکر کیا۔ ''وقائع مسافرت: میر لائق علی خان عماد السلطنۃ سالار جنگ دوئم'' کے تعلق سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس سفرنامے کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان اور ایران کے تعلق سے ایک نئی کڑی کے طور پر سامنے آیا ہے۔ ہندوستان اور ایران کے قدیمی رشتے ہیں۔ ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر کریم نجفی نے ڈاکٹر عمر خالدی کی اس تصنیف کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور ایران کے ادبی و ثقافتی رشتے بہت قدیمی ہیں جنھیں اور مضبوط بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش جاری ہے۔ راجیہ سبھا کے رکن محمد ادیب نے مصنف کو ان کی اس کاوش کے لیے مبارکباد دی۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر عمر خالدی نے وجہ تصنیف کے ساتھ ساتھ سالار جنگ دوئم کے سوانح پر بھی روشنی ڈالی۔ تقریب کے اختتام پر مولانا جنید بناری نے دعا کرائی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے

● ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی تازہ کتاب ''امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے'' کی رسم اجرا روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد کے محبوب حسین جگر ہال میں عمل میں آئی۔ یہ کتاب امریکہ کے بارے میں لکھے گئے ان کے کالموں پر مشتمل ہے۔ تقریب کی صدارت زاہد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے کی۔ محترمہ جولیٹ ورافسر تعلقات عامہ قونصل خانہ امریکہ نے کتاب کی رسم اجرا انجام دی۔ پروفیسر معین انصاری، سید عزیز پاشاہ ایم پی نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ عابد صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ہادی رحیل نے ابتدا میں تعارفی تقریر کی۔ علی ظہیر نے اپنے انگریزی میں لکھے مضمون میں اردو طنز و مزاح کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے مجتبیٰ حسین کے فن کو اس عظیم روایت کا تسلسل قرار دیا جسے اورنگ زیب کے درباری نعمت خان عالی نے شروع کیا تھا اور جس کا ایک اہم ترین ستون غالب بھی رہے ہیں۔ علی ظہیر نے کہا کہ سقوط حیدرآباد کے بعد اہل حیدرآباد ہنسنا بھول گئے تھے۔ حمایت اللہ اور ان کے ساتھیوں نے اہل حیدرآباد کو پھر سے ہنسنا سکھایا جنھوں نے بعد میں زندہ دلان حیدرآباد کے نام سے شہرت پائی۔

پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ اس وقت برصغیر کے دو عظیم ترین مزاح نگاروں مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین میں سے آخرالذکر کا تعلق حیدرآباد سے

ہے۔''امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے'' کے مختلف مضامین کے حوالے دیتے ہوئے بیگ احساس نے کہا کہ مجتبیٰ نے امریکہ میں رہنے والے کئی حیدرآبادیوں کا اتنی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ اس کتاب کو امریکہ میں اہل حیدرآباد کی ڈائری بھی کہا جاسکتا ہے۔ امریکہ میں اردو کی صورت حال بھی اس کتاب میں خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ عزیز پاشاہ ایم پی نے کہا کہ کوئی انسان ستر سال سے تجاوز کر جائے تو اس میں قنوطیت پیدا ہوجاتی ہے لیکن مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں آج بھی جوانی کی تازگی موجود ہے۔

امریکی سفارتی عہدیدار مس جولیٹ ورنے بڑی زندہ دلی کا مظاہرہ کیا انھوں نے کہا کہ امریکہ صحت مند تنقید کو پسند کرتا ہے۔ امریکہ میں صحافت کی آزادی ہے۔ امریکی صحافی ستائش بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی۔ انھوں نے روزنامہ ''سیاست'' کی صحت مندانہ پالیسی کی تعریف کی۔ مجتبیٰ حسین نے اپنی تقریر میں اپنے چاہنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر وہ جذبات سے مغلوب ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین نے کتاب کے مرتب احسان اللہ احمد مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ مجتبیٰ نے جولیٹ ور کی تعریف کی کہ انھوں نے اپنی زندہ دلی سے محفل میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ ہم کو امریکہ کی پالیسیوں سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن امریکی شہریوں کے ڈسپلن اور ان کے دوستانہ جذبات کی ہم قدر کرتے ہیں۔ اس موقع پر مجتبیٰ نے اپنا مضمون ''امریکہ کا وزیر خارجہ ہر ملک کا وزیر داخلہ'' پڑھ کر سنایا جسے بہت پسند کیا گیا۔

آخر میں صدر جلسہ زاہد علی خاں ایڈیٹر ''سیاست'' نے مجتبیٰ حسین کو روزنامہ ''سیاست'' کے خاندان کا ایک اہم رکن بتایا۔ انھوں نے اس موقع پر محبوب حسین جگر کو خراج عقیدت پیش کیا کہ جگر صاحب نے نہایت جانفشانی سے مجتبیٰ کے فن کی آب یاری کی۔ مس جولیٹ ور کی عالی ظرفی کی بھی زاہد علی خاں نے تعریف کی کہ وہ تنقید و تعریف دونوں کو خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے قبول کرتی ہیں۔ (ڈاک سے)

اسلوب بیاں اور

● حیدرآباد۔ 4 دسمبر، اردو مجلس حیدرآباد کے زیراہتمام شائع شدہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کے انشائیوں اور افسانوں پر مشتمل کتاب ''اسلوب بیاں اور'' کی رسم اجرا محترمہ فاطمہ عالم علی کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس محفل کی صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی علالت کی وجہ سے زینت کی عیادت تک نہ کرسکا۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ جب زینت آپا بات کرتی تھیں تو ایک عجیب طرح کی شرارت ان کے چہرے پر ناچ اٹھتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ زینت ساجدہ کا مزاج قلندرانہ تھا جو ان کے خانوادے کا اثر تھا اور کچھ ایسا ہی قلندرانہ مزاج حسینی شاہد بھی رکھتے تھے۔ جسٹس سردار علی خاں نے اپنے خطاب میں کہا کہ زینت ساجدہ کی نثر میں انتہائی اثر انگیزی ہے۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں دکن کے کرداروں کو سمیٹ لیا ہے۔ سلاست، روانی اور ندرت خیال ان کی تحریروں کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں دل کو چھو لینے والی کیفیت تھی۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نے کتاب کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد زینت ساجدہ کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کو یاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ زینت آپا کو فنون لطیفہ کے ہر شعبے پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے زندگی کا ایک ایک لمحہ علم تقسیم کرنے میں صرف کیا اور اس کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ وہ بنیادی طور پر استاد تھیں اور تخلیقی فن کارانہ صلاحیتوں سے ان کا ذہن مالا مال تھا۔ ابتدا میں محترمہ نسیمہ تراب الحسن کا زینت ساجدہ پر تحریر کردہ مضمون نکہت آرا شاہین نے پیش کیا۔ نسیمہ تراب الحسن نے اپنے مضمون میں زینت ساجدہ کے مخصوص انداز تحریر پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ خوبصورت الفاظ کو ادب کے سانچے میں ڈھال دینا زینت آپا کا خصوصی وصف تھا۔ اس موقع پر اردو کے مشہور شاعر جناب رحمٰن جامی نے زینت ساجدہ پر نظم پیش کرتے ہوئے سامعین کو یادوں سے مغلوب کر دیا۔ محترمہ آمنہ انصاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ ہم سب اپنے آپ کو ان کے پس ماندگان میں شمار کرتے ہیں۔ اجلاس کی کارروائی اردو مجلس کے صدر پروفیسر رحمت یوسف زئی نے چلائی۔ جناب سجاد شاہد معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

گرونانک کا سفر حق

● نئی دہلی۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے زیراہتمام آج غالب انسٹی ٹیوٹ میں ماہنامہ صدا (لندن) کے مدیر اعلیٰ اقبال مرزا کی چار کتابوں کی رسم رونمائی انجام پائی۔ ان کی مرتب کردہ کتاب ''گرونانک کا سفر حق'' کا اجرا ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر پروفیسر ستیندر سنگھ نور نے اور مجموعۂ کلام ''جرس زندگی'' کا اجرا روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی نے کی۔ مضامین کے مجموعے ''اجر زندگی'' کا اجرا پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ''اوراق صدا'' کا اجرا پروفیسر مہیپ سنگھ نے کیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر ستیندر سنگھ نور نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاہینہ نے انجام دیے۔ معروف شاعر متین امروہوی نے اپنے کلام سے مہمانان کا استقبال کیا۔

پروفیسر صادق نے کہا کہ اقبال مرزا شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی لیکن اس سے بھی زیادہ ایک کھرے انسان ہیں۔ برطانیہ میں رہتے ہوئے وہ اردو کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

پروفیسر ستیندر سنگھ نور نے کہا کہ گرونانک کے اسفار پر لکھی گئی یہ کتاب بہت بامعنی اور اہم ہے گرونانک نے یہ اسفار اس لیے کیے تاکہ دوسرے ممالک کے صوفیوں اور فقیروں کے ساتھ مکالمہ کیا جاسکے۔ گرونانک نے توحید کی تائید کی اور حمایت کی جو اسلام کی بنیاد ہے۔ پنجابی کلچر کی بات کرتے ہوئے انھوں

نے کہا کہ گروبانی اور صوفی ازم کے بغیر پنجابی کلچر مکمل نہیں ہوسکتا۔ عزیز برنی نے کہا کہ فرنگیوں کی سرزمین پر اردو کا اقبال بلند رکھنے والے اقبال مرزا کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ آج ان کی جن چار کتابوں کا اجرا ہوا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا ان چاروں کتابوں کا ہندی ترجمہ کرانے کا خواہشمند ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اقبال مرزا ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے ہندوستان سے باہر اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے لیے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہندی کے معروف ناول نگار اور ادیب مہیپ سنگھ نے کہا کہ بغیر مکالمہ کے ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔ گرونانک کا یہی پیغام ہے اور اسی مکالمے اور گفتگو کے لیے گرونانک نے اندرون ملک اور بیرون ملک اسفار کیے۔ ڈاکٹر نریندر موہن نے کہا کہ اس کتاب کو ہندی اور پنجابی والے بھی پڑھ سکیں، اس لیے ان کا ہندی اور پنجابی میں ترجمہ بھی کرایا جانا چاہیے۔ پنجابی اکادمی کے سکریٹری رویل سنگھ نے کہا کہ ''گرونانک کا سفر حق'' کے پنجابی ترجمہ کے لیے وہ اسے کمیٹی کے سامنے پیش کریں گے۔

اس موقع پر معروف صحافی فاروق ارگلی نے کہا کہ عالمی اردو ٹرسٹ نے جناب عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ کی قیادت میں اردو کے لیے بڑے کام انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ انھوں نے روزنامہ راشٹریہ سہارا کی اردو کے لیے عظیم خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ادارے کی دلچسپی کے باعث ہی ملک کی 80 سے زیادہ اہم ادبی شخصیات پر مونوگراف شائع ہوئے اور اب مجاہدین آزادی کی سیریز شروع ہوئی ہے۔ اظہار تشکر کرتے ہوئے عالمی اردو ٹرسٹ کے بانی عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ نے کہا کہ عالمی اردو ٹرسٹ کا قیام اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کیا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ندائے رحمت

● کیرانہ۔ 9 دسمبر، مفتی الٰہی بخش اکادمی کے ڈائرکٹر نورالحسن راشد نے ''ندائے رحمت'' نامی کتاب کے اجرا کے موقع پر علما اور مشائخ کو خطاب کیا۔ مذکورہ اجلاس میں مولانا محمد کامل، مولانا حسین، مولانا احترام اور مولانا مقصود احمد سمیت علماے کے ارباب مدارس، اکابر اور دانشور بڑی تعداد میں موجود تھے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مولانا رابع حسنی ندوی اور ندوہ کے مہتمم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی جیسے بلند پایہ علما کی تقریظ ہے۔ نورالحسن نے کہا کہ قصائد کا سلسلہ کافی پرانا ہے۔ 2 صدی پہلے مؤلف کشف الظنون نے لکھا کہ اب تک ان قصائد کے 66 تراجم ہوچکے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے 12 ویں صدی ہجری کے آغاز میں اردو زبان میں مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ نے ان کا منظوم ترجمہ کیا۔ مولانا احترام نے کہا کہ حب رسول اہل علم کی جاگیر نہیں ہے یہ کسی کے بھی دل میں ہوسکتی ہے۔ جلسے کا آغاز مولوی احمد زکریا کی تلاوت اور شمس الحسن کی نعت پاک سے ہوا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

مسافت

● مراد آباد۔ مراد آباد کے نوجوان شاعر سعید نعمانی کے اردو دیوان ''مسافت'' کا اجرا میئر ڈاکٹر ایس ڈی حسن نے کیا۔ نگر نگم کے مجلس ہال میں منعقد ایک تقریب میں بزم ہوش نعمانی کی جانب سے شاعر سعید نعمانی کے دیوان مسافت کا اجرا کرتے ہوئے میئر ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے کہا کہ یہ نوجوان شاعر جس نے صاحب دیوان ہونے کا شرف حاصل کیا ہے ہم اپنی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ منصور عثمانی نے بھی ان کی غزلوں پر اپنی روشنی ڈالی۔ سابق میئر ہمایوں قدیر نے بھی نوجوان شاعر کی کوششوں کو سراہا۔ تقریب کے مہمان خصوصی صولت پبلک لائبریری رام پور کے صدر س ش عالم، ڈاکٹر منور تابش، اظہر نعمانی، کارپوریٹر محمد جان انصاری معظم، شباب مرادآبادی، دلکش آفریدی، سلیم کیفی، بہار سنبھلی، لکشمن پرسادھنہ، ڈاکٹر عارف حسن و شہر کے بزرگ شاعر شاہد احسن مرادآبادی بھی موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت جاوید رشید عامر نے کی۔

□□□

''اردو دنیا'' کے مضمون نگاروں سے گزارش

- بات پوری وضاحت سے کہیں لیکن عبارت آرائی سے گریز کریں۔
- ''اردو دنیا'' میں ایسے مضامین کی اشاعت کو ترجیح دی جاتی ہے جو عصری زندگی کے کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوں۔
- زبان آسان اور عام فہم استعمال کریں اور اختصار کو ملحوظ رکھیں۔
- بچوں کے کالم کے لیے کہانی یا مضمون کم سے کم 2000 الفاظ پر مشتمل ہو۔
- غیر طلبیدہ مضامین ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں تبھی واپس ہوسکیں گے جب ان کے ساتھ مناسب سائز کا ٹکٹ لگا لفافہ موصول ہو۔

—ایڈیٹر

تبصرہ وتعارف

قطب مشتری

مصنف: اسد اللہ وجہی
مرتب: ڈاکٹر حمیرا جلیلی
صفحات: 234، قیمت: -/48 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی
مبصر: عبدالسمیع، 102 کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-67

رفتہ رفتہ اردو کی نئی نسل اپنے کلاسیکی ادب سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اس دوری کی کئی وجوہ ہیں جن میں ایک اہم وجہ کلاسیکی ادب کی کتابوں کی عدم دستیابی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس حوالے سے قابل تعریف کام کررہی ہے۔ اس ادارے نے قدیم اردو کتابوں کے مستند اور دیدہ زیب اڈیشن شائع کیے ہیں۔

کلاسیکی ادب کی قرأت اور تفہیم بھی ایک مسئلہ ہے۔ عام قاری اس سے اس طرح نجات حاصل کرتا ہے کہ وہ فن پاروں کے انتخابات یا ان پر مشاہیر کی تنقیدی آرا کو پڑھ لینا کافی سمجھتا ہے۔ ایسی صورت میں کلاسیکی ادب پر مشتمل کتابوں کی کھپت بھی کم ہوتی ہے جس سے ناشرین بدظن ہوجاتے ہیں۔

کلاسیکی ادب کی قرأت اور تفہیم میں جس قسم کی جگر سوزی مطلوب ہے اس سے آج کا عام قاری محروم نظر آتا ہے۔ خصوصاً جب اس کلاسیکی ادب کا تعلق اردو کے دکنی دبستان سے ہو۔ ایسی صورت میں اگر کوئی کلاسیکی دکنی ادب پارے کی تدوین وترتیب میں اپنا وقت صرف کرتا ہے تو وہ لائق تحسین ہے۔ ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے اسد اللہ وجہی کی مشہور مثنوی ''قطب مشتری'' ترتیب دی ہے جس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ کتاب مرتب کرنے میں انھوں نے جو محنت کی ہے اس کا اندازہ ان کے درج ذیل بیان سے ہوسکتا ہے:

''اس مثنوی کو سب سے پہلے 1938 میں مولوی عبدالحق نے شائع کیا۔ مقدمہ صفحہ نمبر-18 پر وہ لکھتے ہیں کہ متن انھوں نے دو نسخوں سے مرتب کیا ہے۔ ایک خود ان کا عکس انھوں نے منگوالیا تھا...... زیر نظر متن میں نے چار نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے جن میں لندن کے نسخے کو ''ل'' دلی کے نسخے کو '' د'' کراچی کے نسخے کو ''ک'' اور مطبوعہ نسخے کو ''م'' نشان دیا گیا ہے۔''

(حرف اوّل ص-7)

چار نسخوں کی مدد سے مرتبہ قطب مشتری کے اس متن کی قرأت یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ محترمہ حمیرا جلیلی نے چاروں نسخوں کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ جگہ جگہ حواشی میں ان مختلف عبارتوں کو نقل کیا ہے جو مختلف نسخوں میں باہم مختلف تھیں۔ اس طرح ہم صرف اس ایک نسخے کو پڑھ کر چاروں نسخوں کے متن سے واقف ہوسکتے ہیں۔

متن سے قبل مرتبہ نے حرف اول میں اپنی کدوکاوش کے ذکر کے علاوہ قطب مشتری کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ قطب مشتری کے اسلوب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''قطب مشتری شروع سے آخر تک پڑھ ڈالیے کہیں کوئی بوجھل یا ثقیل لفظ نہیں ملتے، نادر اور اچھوتی تشبیہات اور استعارے، جاندار منظر نگاری، انسانی نفسیات اور تمدنی و اخلاقی اقدار کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس کی دلکشی اور مہک وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہے گی۔'' (حرف اوّل ص-2)

مرتبہ کا تحریر کردہ مقدمہ پراز معلومات ہے۔ مثنوی کے باب ''درشرح شعر گوید'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے اردو شعریات اور فن تنقید پر اردو کی پہلی دستاویز قرار دیتی ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ اس سے پہلے اتنی تفصیل سے کسی شاعر یا نثر نگار نے شعر کی خصوصیات پر اتنی جامع بحث نہیں کی جتنی کہ وجہی نے کی ہے اس سلسلے کا ان کا ایک شعر دیکھیے:

جو بے ربط بولے توں بیتاں بچیس
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

25 صفحات پر مشتمل مرتبہ کا مقدمہ نہ صرف تحقیقی نوعیت کا ہے بلکہ اس میں قطب مشتری اور مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا تقابلی مطالعہ بھی ہے۔ قطب مشتری اور غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کے چند اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتی ہیں:

''اس (قطب مشتری) کے مقابلے میں اگر سیف الملوک و بدیع الجمال میں وجہی کے قریبی حریف غواصی کی منظر نگاری کو دیکھا جائے تو وہ بڑی حد تک پھیکی اور بے رنگ نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غواصی بھی ایک بڑا شاعر تھا جس نے بعد میں دربار میں وجہی کی نشست حاصل کرلی۔ پھر بھی جہاں تک ادبی معرکوں کا سوال ہے وہ کئی خصوص میں وجہی سے پیچھے ہی تھا۔''

(مقدمہ ص-16)

مرتبہ نے قطب مشتری کا موازنہ صرف غواصی کی مثنوی سے ہی نہیں کیا ہے بلکہ خود وجہی کے تصنیف کردہ نثری داستانوی شاہکار ''سب رس'' کا مطالعہ متوازی طور پر کرتے ہوئے دونوں کے اسلوب اور لفظیات کے اشتراک اور یکسانیت سے بحث کی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے چند اشعار نقل کیے ہیں اور پھر ان کے سامنے ''سب رس'' سے اقتباس دیا ہے ایک مثال ملاحظہ ہو،

جکوی بوالہوس ہور طمع دار ہے
جہاں جائے گا وہ وہی خوار ہے

(قطب مشتری ص-140)

جس کے سر پر طمع کا بھار، اس کا سر دائم خار، بے مغز خالی سر بھو نچھ پر پڑتا پھر پھر، طمع نے بڑائی جاتی۔ طمع دار کوں بڑی بات کاں آتی۔"

(سب رس ص-138)

(مقدمہ ص-24,25)

مختصر مگر جامع مقدمہ کے بعد مرتبہ نے قطب مشتری کا ''لسانی مطالعہ'' پیش کیا ہے جو نہ صرف ان کی دقت نظری بلکہ وسیع مطالعے کا غماز ہے۔ 65 صفحات پر مشتمل یہ لسانی مطالعہ گرامر اور تدریس قطب مشتری نیز تفہیم متن کے سیاق میں عمدہ کاوش ہے۔ اس مطالعے میں ''قطب مشتری'' کا سارا نحوی اور صرفی نظام سمٹ آیا ہے۔ یہ مطالعہ مرتبہ کی فکری اور لسانی استعداد کو نمایاں کرتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ قطب مشتری پر یہ اپنی نوعیت کا اس دور میں عمدہ کام ہے۔

مرتبہ نے اپنے مقدمے میں مشاہیر کی آرا کو بطور دلیل پیش کیا ہے مگر ان اقتباسات کے حوالے نہیں ہیں۔ مقدمے کے پہلے صفحے پر انھوں نے عربی شاعر ابن مقفع اور سنسکرت شاعر مست کے اقوال نقل کیے ہیں مگر حوالہ مندرج نہیں ہے اسی طرح صفحہ 18 پر بجنوری (عبدالرحمان) صفحہ 19 پر بہاری صفحہ 23 پر فرانسیسی ادیب والیٹر کے اقوال درج ہیں مگر ان کے حوالے نہیں دیے گئے ہیں۔ موجودہ دور میں اس طرح کی فروگزاشتوں سے کتاب کے اعتبار پر حرف آتا ہے۔ لہٰذا اس کا خیال رکھا جانا ضروری ہے۔

دوسری بات جو کھٹکتی ہے وہ اس ضمیمے کی عدم شمولیت ہے جو قطب مشتری مرتبہ مولوی عبدالحق میں شامل ہے۔ ایک مختصر نوٹ کے ساتھ فرہنگ سے پہلے شامل کردینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ ضمیمہ کتاب کا ایک حصہ ہے۔

دل کی گیتا یعنی شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو نظم میں

مترجم: خواجہ دل محمد

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: فاضل انصاری، اسلام باغ، شیخ سرائے، سیتاپور، یو پی-261001

بھگوت گیتا اہل وطن کا مقدس صحیفہ ہے۔ اس کے مرتب مہارشی وید ویاس ہیں جنھوں نے ویدوں کو ترتیب دیا ہے۔ گیتا کا زمانہ تحقیقی ویدوں کے بعد کا ہے جب کروکشیتر کے میدان میں دو چھتریہ خاندانوں میں مہابھارت کی جنگ ہوئی ارجن پانڈوؤں کی طرف سے کمانڈر ان چیف کے فرائض کی انجام دہی پر مامور تھے تو کوروؤں کی طرف ارجن کے گرو درونا آچاریہ کمان سنبھالے ہوئے تھے۔ مخالف صف میں ارجن کے اعزا اور استاد کی شمولیت نے ارجن کے پائے استقامت کو لڑکھڑا دیا اور وہ آلات حرب پھینک کر جنگ سے علیحدگی پر آمادہ ہوگئے۔ اس نازک موقع پر سری کرشن نے ارجن کو ان کا فرض منصبی یاد دلایا اور ''آتم گیان'' دے کر جنگ میں اپنے چھتریہ جوہر دکھانے کے لیے آمادہ کیا اس موقع پر سری کرشن نے جو اُپدیش دیے ان کے مجموعے کا نام گیتا ہے۔ ان اُپدیشوں میں جسم اور روح کی ماہیت اور ان کا باہمی تعلق، عقیدۂ تناسخ، منومہاراج کی درن ویوستھا برہمن چھتریہ ویشیہ اور شودر کی سماجی تقسیم ان کے کام جیسی بہت سی باتیں سنسکرت کے اشلوکوں میں سموئی ہوئی ہیں جنھیں ''برہم گیان'' کہا گیا ہے۔ جیسا کہ خواجہ دل محمد نے اپنے دیباچے میں کہا ہے کہ تمثیل کے پیرائے میں ''انسان کا تن کروکشیتر'' کا میدان ہے، من چھتریہ دھرم ہے، حق و باطل، نیکی و بدی متقابل فوجیں ہیں جو آپس میں ہمہ وقت برسر پیکار رہتی ہیں۔ نیکی کی فوج کا سردار ضمیر ہے، جو یدھشٹر کی طرح اس جنگ میں مستقل مزاج رہتا ہے۔ دوسری طرف بدی کی فوج ہے، جس کا سردار نفس امارہ ہے۔ جو دھرت راشٹر (اندھے راجا) کی طرح دوسرے کے راج کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔ ارجن کی طرح انسان کو چاہیے کہ اپنی رتھ (قوت عمل) کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں دے، جذبات کو فرائض پر غالب نہ آنے دے۔ حق کے دفاع کی پوری کوشش کرے اور سب کام نشکام کرم سمجھ کر خدا کے لیے اور خدا ہی کا کام سمجھ کر پورا کرے۔ خدا اس کا مددگار ہوگا!'' ص-52

گیتا کی تفہیم اور بھی اردو مصنفین نے کی ہے اور گیتا کی تفسیر و تعبیر پر کتابیں لکھی ہیں۔ خواجہ صاحب نے ترجمے میں در آئے اصطلاحی، تمثیلی، تلمیحاتی الفاظ اور فقروں کی اور زیادہ آسان زبان میں تفسیر و تشریح حواشی میں درج کرکے اسے آسان سے آسان تر بنا دیا ہے۔

گیتا میں اٹھارہ ادھیائے (ابواب) ہیں اور ایک ہزار چار سو اشلوک جن کا منظوم ترجمہ، دو ہزار آٹھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں اشلوکوں کی تعداد مساوی نہیں ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ترجمہ سلیس و سادہ ہے۔ خواجہ صاحب قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے ادق علمی و فلسفیانہ مسائل کو جس سہل انداز میں شعر کا جامہ پہنایا ہے، وہ ان کی علمی استعداد اور ان کے ذوق و شوق کا غماز ہے۔ ایک دو شعر دیکھیے:

ہے فانی بدن، آتما لازوال
پھر ارجن ہے کیوں جنگ میں قیل وقال
بتایا خفی آدھیاتم کا راز
گیا موہ، آنکھیں ہوئیں دل کی باز

قادرالکلامی کے باوجود کہیں کہیں ان کا عدم تفکر بھی نمایاں ہوا ہے۔ ایک

گنگا کو نہروں میں شمار کر گئے ہیں:

مجھے مچھلیوں میں مکر جان تو
تو نہروں میں گنگا مجھے مان تو

''وحدت اور کثرت'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں ''اصل ہر ایک شے کی ایک ہے صرف نام اور روپ یعنی صورت ظاہری کا فرق ہے۔'' آتما (روح) کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ ''تن پیکر کثیف ہے تو حواس پیکر لطیف اور آتما وہ اصل چیز ہے جس کا نام انسان ہے۔'' (ص-25)

اگلے ذیلی عنوان ''پرکرتی (مادی دنیا)'' کے بارے میں گیتا کا نظریہ یوں بیان کیا ہے کہ اسی کو نیچر یا مایا کہتے ہیں۔ مایا کے تحت ہی ستوگن، رجوگن، تموگن کا بیان ہوا ہے۔ ستوگن برہمن چھتریوں کی میراث ہے، رجوگن ویشوں کے لیے مخصوص ہے تو تموگن کے نمائندے شودر ہیں۔ ستوگن والے موکش پاتے ہیں رجوگن کی آتمائیں انسان کی یونی میں بار بار پیدا ہوتی ہیں تو تموگن کی آتمائیں حیوانات و نباتات بنتی ہیں۔ ستوگن صفات علوی، رجوگن صفات جذباتی اور تموگنی انسانوں کی صفات سفلی ہیں۔ نجات کے تین راستے ہیں کرم مارگ (راہِ عمل) بھگتی مارگ (راہ عشق و محبت) اور گیان مارگ (راہ عرفان) سے عبارت ہے۔ کسی ایک پر چلنے سے موکش ملتا ہے، آواگمن کا چکر ختم ہوجاتا ہے۔

گیتا کے مطابق سری کرشن خود کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے اور اپنے صفات الوہیت پاتے تھے انسانی شکل میں اوتار لینے کی وجہ یوں بیان کی ہے

یہ اندھیر جب دیکھ پاتا ہوں میں
تو انساں کی صورت میں آتا ہوں میں
میری ذات ہے مالکِ کائنات
نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات

گیتا میں بیان کردہ عقائد میں تناسخ، تجرد، یوگ، سنیاس، وحدت الوجود، ورن سسٹم، فنافی اللہ وغیرہ شامل ہیں چند اشعار میں ان کی جھلک یوں نظر آتی ہے۔

وہ دنیا میں پائے جو تازہ حیات
ہوں سب اس کے پچھلے جنم کے صفات
رہے پرسکوں بے خطر مستقل
تجرد پہ قائم ہو قابو میں دل
نہ لے غیر کا دھرم گو خوب ہے
کہ دھرم اپنا ناقص بھی مرغوب ہے
عبادت ریاضت سخاوت کرے
مگر حرف تت پہلے منھ سے کہے
فقط شامتر کو تو بنا رہنما
کہ کرنا ہے کیا اور نہ کرنا ہے کیا

جس طرح ہر مذہب کا علمبردار اطوار زمانہ کا شاکی ہے۔ گیتا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے:

مگر اب ہے دورِ زماں کا یہ حال
کہ اس یوگ کو آگیا ہے زوال

حاصل کلام یہ ہے کہ خواجہ دل محمد نے گیتا کا اردو میں آسان منظوم ترجمہ کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

دنیا میں ایڈس

مصنف: جعفر محمود

صفحات: 425، قیمت: -/456 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: محبوب حسن، روم نمبر-33، ماہی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

ایڈس (AIDS) ایک مہلک اور خطرناک عارضہ ہے۔ یہ بیماری جراثیم زدگی (Infection) کے ذریعے ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہوتی ہے۔ ایچ.آئی.وی. (HIV) جراثیم کے باعث پھیلنے والی یہ بیماری 1980 کے آس پاس دریافت ہوئی لیکن اس قدر تیزی سے پھیلی کہ اب تک دو کروڑ افراد اس کی گرفت میں آکر دردناک موت کا شکار بن چکے ہیں۔ یہ بیماری خاص طور پر جنسی بے راہ روی کے سبب پھیلتی ہے۔ یہ جان لیوا بیماری عالمی منظرنامے پر ہنگامی اور ایک بڑے چیلنج کی شکل میں ابھری۔ اس کی روک تھام کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی سرکاری و غیر سرکاری ادارے اور تنظیمیں کام کررہی ہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے ہمارے ملک میں بھی لوگوں کی توجہ اس جانب مرکوز ہوئی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی تعاون کے ذریعے اس سماجی وبا پر قدغن لگانے کی ہر ممکن کوشش جاری ہے۔ اس کوشش کی کامیابی کا انحصار لوگوں کی بیداری پر ہے۔

اس دلدوز سماجی وبا کے حالات و مسائل سے متعلق انگریزی میں اور ہندوستانی زبانوں میں بھی بہت سی کتابیں دستیاب ہیں لیکن جب ہم اردو زبان میں اس اہم موضوع پر کتابیں تلاش کرتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اردو میں اس موضوع پر کتابیں نہ کے برابر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً ایسے تعارفی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جو اس عارضے سے متعلق ہوتے ہیں۔ ''دنیا میں ایڈس'' جعفر محمود صاحب کی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں ہمیں جدید تحقیق کی روشنی میں ایڈس اور اس کے عواقب سے واقف کرایا گیا ہے اور عالمی سطح پر پھیلنے والے اس مرض کے منفی اثرات کا احاطہ معروضی انداز میں کیا گیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں مصنف نے ایڈس کے بارے میں تمام ضروری

معلومات فراہم کی ہے اور ایڈس میں مبتلا ہونے کے اہم اسباب اور اس کے اثرات ونتائج پر گفتگو کی ہے۔ دوسرے مضمون میں مصنف نے ایڈس کے علاج اور مغربی ممالک میں علاج کے جدید ترین امکانات پر روشنی ڈالی ہے نیز اس کی روک تھام کے لیے ایجاد ہونے والے انجکشن (Injection) اور ویکسین (Vaccine) کے عواقب پر بھی لکھا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”انسانوں پر آزمائشوں کے بعد ویکسین کی فراہمی بھی بہت زیادہ پیچیدہ نوعیت کی ہوگی ہے جو کہ بالکل درست ہے۔

اگلے باب میں جعفر محمود نے چند ترقی یافتہ اور بعض ترقی پذیر ممالک میں ایڈس کے مضر اثرات اور اس کی صورت حال کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے انھوں نے آسٹریلیا، برازیل، چین، ہندوستان، آئرلینڈ، کینیا، میکسکو، نیدرلینڈ، اسپین، سوئزرلینڈ کے علاوہ مشرقی و مغربی یورپ، افریقہ یونائیٹڈ کنگڈم اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیسے ممالک میں ہوئے حالیہ سروے (Survey) کے نشیب وفراز کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان میں متاثرین کو درپیش مسائل اور ان کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کو دیانت داری کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔

آخری صفحات میں چند ویب سائٹس (Websites) کا ذکر ہے۔ جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ وضاحت طلب اصطلاحات کی فرہنگ نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان طبی اصطلاحات (Medical Terms) کی توضیح عام فہم زبان میں کی گئی ہے۔ اصطلات کی اس تشریح کے توسط سے نفس مضمون کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

مختصر یہ کہ 425 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک کارآمد مفید پیشکش ہے۔ مصنف نے عصرِ حاضر کے ایک حساس اور اہم ترین مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی یہ کاوش نہایت معلومات افزا اور تحقیقی ہے اور سماج کے ہر طبقے کے لیے قابلِ استفادہ ہے۔ سماجی کارکن، ریسرچ اسکالر، طلبہ وطالبات، ڈاکٹر اور دیگر حضرات اس کتاب سے رجوع کر سکتے ہیں۔

الفاظ کی دنیا

مصنفہ: ڈاکٹر حلیمہ فردوس

صفحات: 116؛ قیمت: -/90 روپے

مبصر: پروفیسر خالد سعید، AI-414، نیشنل گیمز ہاؤزنگ کامپلکس، کورامنگلا، بنگلور-47

ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی کتاب ”الفاظ کی دنیا“ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک اہم اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ کتاب میں شامل کھیلوں کی تیاری میں الفاظ سازی، تلفظ شناسی، املا سے واقفیت، جمع، صفات، اضداد، تراکیب، مترادفات، متعلقات، تشبیہات، محاوروں اور کہاوتوں کی شناخت اور ان کی تفہیم اور ان کا استعمال، منظر کشی، کردار نگاری اور شعر فہمی جیسے تدریسی اُمور شامل ہیں۔

الفاظ سازی سے متعلق کھیلوں میں تلفظ کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے جیسے ہم آواز حروف کی شناخت اور اعراب کے سبب تلفظ کا بدل جانا وغیرہ۔ چند مشقوں میں تحریر کے دوران میں اِملا اور ہجا کی سرزد ہونے والی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کئی مشقیں روایتی اصطلاح میں قواعد کی تدریس وتفہیم پر مشتمل ہیں۔ ان میں جمع بنانے، تذکیر وتانیث اور صفتوں سے متعلق مشقیں بھی شامل ہیں۔ کئی مشقوں میں مختلف مرکبات، سابقوں اور لاحقوں سے تشکیل پانے والے مرکبات ان کی ساخت اور ان کے مفہوم سے طلبہ کو واقف کرایا گیا ہے۔ پندرہ مشقیں محاوروں سے متعلق ہیں۔ یہ مشقیں محاوروں کو یاد کرانے، ان کے مفاہیم اور مطالب سے آگاہ کرانے، محلِ استعمال سے واقف کرانے کی غرض سے تیار کی گئی ہیں۔ ان مشقوں کو دلچسپ اور دلکش بنانے کے لیے تصویروں کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ محاوروں اور کہاوتوں سے متعلق سانپ اور سیڑھی کا کھیل جو واقعتاً کھیل بھی ہے اور تدریس بھی۔ ایسے کئی کھیل کی تیاری میں مصنفہ نے دِقّت نظری، محنتِ شاقہ اور خلاقی کا ثبوت دیا ہے۔

اگرچہ کہ یہ ساری مشقیں زبان کے کسی نہ کسی رمز یا کسی لسانی خوبی سے طلبہ کو آگاہ کرنے کے لیے تیار کی گئی ہیں لیکن چند مشقیں ایسی بھی ہیں جو لسانی مقصد کی تکمیل کے علاوہ سماجی و معاشرتی قدروں سے روشناسی پر بھی مشتمل ہیں۔ مثلاً مشق پندرہ کا مقصد تلفظ سے آگاہی کے ساتھ ساتھ طلبہ کو توہم پرستی سے گریز کا سبق بھی سکھاتا ہے اور یہ مقصد بین السطور میں پایا جاتا ہے۔ مشق 87 میں اردو کے چند نامور شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں دی گئی ہیں۔ انھیں پہچان کر ان کے نام لکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس مشق کا مقصد طلبہ کو اپنے ادبی اسلاف سے روشناس کراتا اور ان سے اُنسیت پیدا کراتا ہے۔ تعلیم کے نئے تصورات کے مطابق آج کل الفاظ کے محلِ استعمال کے ذریعے ان تصورات کی تفہیم کو ترجیحی حیثیت حاصل ہے جو ان سے وابستہ ہیں۔

اس کتاب میں کل 87 مشقیں ہیں۔ لسانیات کی رُو سے ان مشقوں کو حسبِ ذیل زمروں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ صوتی مشقیں، صرفی مشقیں، نحوی مشقیں، ان کے علاوہ کچھ ایسی مشقیں بھی ہیں جو ان تینوں میں سے کسی بھی ایک زمرے میں نہیں رکھی جاسکتیں۔

بہرحال یہ ساری مشقیں لسانی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے تیار کی گئی ہیں اور مصنفہ نے لسانی رموز کو ان کھیلوں میں پیش کیا ہے جس کے سبب زبان کی تدریس بے حد سائنٹیفک ہوگئی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے کتابت اور طباعت بھی خوب ہے۔

ہندو پاک کی خواتین ناول نگار

مصنف: ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک

صفحات:375، قیمت:-/550روپے
ناشر:ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک، B-70، تیسری منزل، آشیانہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی-95
مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جے. این. یو، نئی دہلی۔ 67

اردو میں ناول نگاری کی روایت کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے اس طرح ناول نگاری کی صنف اگر چہ بہت پرانی نہیں لیکن کچھ ایسی نئی بھی نہیں ہے اس کے بعد ایک خاص موڑ پر اردو ناول میں انگریزی ناول سے اثر و استفادے کا رجحان عام ہوا۔ ہمارے یہاں اب بھی ناول لکھے جارہے ہیں اگر چہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اردو میں ناول نگاری کی جو شاندار روایت رہی ہے اس کے مقابلے میں ہم عصر ناول کچھ ہلکا پھلکا معلوم ہوتا ہے اس صنف کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں ابتدا سے ہی خواتین کی حصے داری دوسری اصناف کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ رہی ہے اور ہر زمانے میں ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا۔ اگر چہ قرۃ العین حیدر کو یہ شکایت رہی ہے کہ ادبی تنقید میں لیڈیز کمپارٹمنٹ بنا کر عورتوں کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ اس شکایت کے پیچھے شاید یہ احساس کارفرما رہا ہو کہ ان کی والدہ نذر سجاد حیدر کے ناولوں پر اردو کے بڑے نقادوں نے کچھ نہیں لکھا لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود قرۃ العین حیدر کو اردو کی سب سے بڑی ناول نگار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تو یہ شکایت کس قدر بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ قرۃ العین حیدر سے پہلے حجاب امتیاز علی، خدیجہ مستور اور ممتاز شیریں وغیرہ کی خدمات کو بھی اردو کے کم و بیش سارے اہم نقادوں نے سراہا ہے لیکن تمام خواتین ناول نگاروں کی خدمات کا جائزہ ایک مستقل کتاب کی صورت میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک نے ''ہندو پاک کی خواتین ناول نگار'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا جسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں پہلے باب ''برصغیر میں عورت کی حیثیت'' کو برائے بیت سمجھنا چاہیے۔ دوسرے باب میں انھوں نے دو ذیلی عنوان قائم کیے ہیں جن میں سے ایک میں آزادی سے قبل خواتین کے ناولوں کا عام جائزہ لیا ہے تو دوسرے میں آزادی کے بعد ہند و پاک کی خواتین ناول نگاروں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں تین ذیلی عناوین ہیں پہلا ''ہند و پاک کی خواتین ناول نگاروں کا سماجی، سوانحی پس منظر'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے دوسرا باب ''ہندوستانی خواتین کے ناولوں میں موضوعات، ہیئت تکنیک اور اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے سپرد تحریر کیا گیا ہے۔ اور تیسرے ذیلی عنوان میں موضوعات ہیئت، تکنیک اور اسلوب کی بنیاد پر پاکستانی خواتین کے ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا باب چار ذیلی عناوین رکھتا ہے ان میں پہلا عنوان ہندوستانی خواتین کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا مطالعہ پیش کرتا ہے تو دوسرا عنوان پاکستانی خواتین کے ناولوں میں، اور تیسرے عنوان میں ان دونوں ملکوں کی خواتین ناول نگاروں کے نسوانی کرداروں کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے عنوان میں خواتین اور مرد ناول نگاروں کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس طرح یہ کتاب خواتین ناول نگاروں کی مجموعی خدمات اور ان کے طرز احساس کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی اور خواتین قلم کاروں کو خصوصاً ناول نگاروں کو بھی یک گونہ مسرت کا احساس ہوگا کہ وہ صحرا میں اذان نہیں دے رہی ہیں اور ان کے رشحات قلم کو سراہا بھی جارہا ہے۔ کتاب کے مصنف غلام محی الدین انصاری سالک کا طرز تحریر بھی موزوں ہے اور وہ اپنی بات سلیقے سے کہنا جانتے ہیں۔

شکستہ خاطر (شعری مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی (راشد اعظمی)
صفحات:174، قیمت:-/100روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: زبیر شاداب، ناردن ریجنل لینگویج سینٹر، پنجابی یونیورسٹی کیمپس، پٹیالہ-2

''شکستہ خاطر'' ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی کا شعری مجموعہ ہے جو ان کا تعارف راشد اعظمی کی حیثیت سے کراتا ہے۔ چونکہ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے اس لیے ان کی شاعری کو زیادہ دقت نظر سے دیکھنا قدرے نامناسب ہوگا۔ زبان کی لوچ سے بعض اوقات شاعر کو فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ راشد ابھی سود و زیاں کی مشترکہ لذت سے دوچار ہیں باوجود اس کے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ شکستہ خاطر کی غزلیں پڑھ کر آہ اور واہ کے رسمی تکلفات سے اِک ذرا مختلف نوعیت کے تجربے کا احساس یوں ہوتا ہے کہ اس میں شاعر نے نہایت سادگی اور معصومیت سے اپنے تجربات و کیفیات کو نہ صرف یہ کہ ظاہر کیا ہے بلکہ یہ یقین دلانے میں کامیاب بھی ہوا ہے کہ اظہار میں صداقت و شدت ہو تو ترسیل کی ناکامی سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ جذبہ زبان کے منطقی استعمال پر غالب آجاتا ہے اور قاری کے ذہن کی بجائے دل کو اپنی قیام گاہ بنالیتا ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ تو کہنا ذرا دشوار ہے کہ اس کی سبھی غزلیں اپنی معنویت کے لحاظ سے لائق ستائش ہیں لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ایک سخت ترین انتخاب کے بعد بھی اس کے متعدد اشعار خاطر میں لائے جاسکتے ہیں جن میں حیات و کائنات کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور سہل سے سہل مسائل کی ترسیل نہایت آسانی سے کی گئی ہے۔ راشد نے اپنی غزلوں میں زندگی کے جان لیوا عشوہ و ادا کے علاوہ میٹھے میٹھے درد سے دوچار رکھنے والے واردات قلب و نظر کو بھی بڑی بے باکی سے برتا ہے۔ ان کا پسندیدہ رویہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگاہ حیات کے ان معاملات پر مرکوز کرنے میں زیادہ مضطر ہیں جن سے عام انسان کا سابقہ

تقریباً ہر شب و روز پڑتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایک عام انسان کی خواہشات کی اہمیت کو راشد اعظمی نہ صرف یہ کہ سلیقے سے کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ اس کے اظہار میں بعض اوقات ایک بلند نباض کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اٹھائے غیر کا تابوت کس کو فرصت ہے
ہر ایک شخص کے کاندھے پہ اپنی میت ہے
شکل تو سب کی ایک جیسی ہے
لوگ ملتے ہیں کیوں خدا بن کر

پہلا شعر نہ صرف یہ کہ ہمارے عہد کی غیر انسانی مصروفیت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے ضمیری کی اجتماعی صورت کو پیش کرتا ہے بلکہ اس المیے کی جانب سے بے توجہی کا احساس بھی دلاتا ہے جس پر توجہ دینا انسانیت کی بقا کا ضامن ہے۔ دوسرا شعر بظاہر غیر استدلالی محسوس ہوتا ہے لیکن جب عہدِ رواں کے آدمی، اُس کے کردار و اعمال اور اس کی بے چہرگی کو میزان بنا کر پرکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس شعر میں اس کی اپنی صورت اور کارکردگی پر بات کی گئی ہے۔ ''شگفتہ خاطر'' کے چند اشعار اس لیے درج کیے جارہے ہیں تاکہ قاری راشد کے ذریعے برتے گئے مختلف قسم کے موضوعات سے روبرو ہوسکے اور اسے بذاتِ خود یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ اس شعری مجموعے کی پذیرائی ہونی چاہیے یا نہیں۔

دھیرے دھیرے وقت کردیتا جدا اک دن ہمیں
جس طرح بچھڑا ہے وہ، منظر کوئی اچھا نہ تھا
دن گزرتا ہے تغافل میں غمِ دوراں کے
شام ڈھلتی ہے تو دل رات کی رانی مانگے
کون سی میری ادا بھاگئی جانے اس کو
کامرانی کی دعا دشمنِ جانی مانگے
بسمل پھر کیوں لوٹا کوچہ دلبر میں
کچھ تو اچھی بات ہے اس کے خنجر میں
حیرانی کا ایک تسلسل آنکھوں میں
کس کو ڈھونڈتی رہتی ہیں ہر منظر میں

فروغِ نوا (مجموعۂ نعت)

شاعر: رئیس احمد نعمانی

صفحات: 160، قیمت: -/80 روپے

ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ-202002

زیرِ تبصرہ کتاب رئیس احمد نعمانی کا نعتوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ جو انھوں نے اپنی والدۂ مرحومہ کے نام منسوب کیا ہے۔ بقول شاعر مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عشق، عاشق، معشوق جیسے الفاظ کو قطعاً استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ سیدالانبیاؐ کی شانِ مبارک میں، دوسرے نعت گو شعرا کی طرح 'تو' اور 'تیرا' جیسے الفاظ کسی شعر میں نہیں لائے گئے ہیں، حضورؐ کا اسم گرامی بھی احتراماً نیز عمداً .... متنِ سطر میں نہیں لایا گیا ہے بلکہ ضمائر و صفات کے توسط سے بات کہی گئی ہے اور بعض دیگر شعرا کی طرح خدا اور رسولؐ کے امتیاز کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی نعتیہ شاعری میں یہ نعتیں ایسا نمونہ ہیں جن میں ذاتِ نبویؐ کے احترام واقعی کو ملحوظ رکھنے پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس بنا پر امید کی جاسکتی ہے کہ یہ نعتیہ مجموعہ خاص و عام میں مقبولیت حاصل کرے گا۔

علی جواد زیدی: شخصیت اور شاعر

مصنف: ڈاکٹر عابد حسین حیدری

صفحات: 144، قیمت: -/150 روپے

ناشر: ڈاکٹر عابد حسین حیدری، صدر شعبۂ اردو، ایم۔جی۔ایم۔ (پی۔جی) کالج، سنبھل مرادآباد، یو۔پی-244302

علی جواد زیدی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، انھوں نے تقریباً سات دہائیوں تک علم و ادب کی خدمت کی۔ ان کی شخصیت کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن میں سے ہر پہلو دوسرے سے تابناک نظر آتا ہے۔ ان کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں پدم شری کے خطاب سے نوازا۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''علی جواد زیدی: شخص اور شاعر'' ڈاکٹر عابد حسین حیدری کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے جس میں انھوں نے مندرجۂ ذیل عنوانات سے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ علی جواد زیدی: ایک تعارف، علی جواد زیدی کی غزل گوئی، علی جواد زیدی کی نظم گوئی، علی جواد زیدی اور شخصی مرثیہ، علی جواد زیدی اور دیگر اصنافِ سخن، انتخابِ علی جواد زیدی سے ایک گفتگو آخر میں کتابیات کی فہرست ہے۔ مصنف نے سبھی مضامین میں معروضیت اور استدلال منطقی کا خیال رکھتے ہوئے غلو اور مبالغے سے اجتناب برتا ہے۔ تنقید میں غیر جانب داری اور تحقیق میں تجسس اس کتاب کی اہم خوبیاں ہیں جن کی بنیاد پر امید کی جاتی ہے کہ مصنف کی یہ ادبی کاوش خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی۔

تحقیق اور تاریخ

مصنف: حنیف انصاری

صفحات: 116، قیمت: -/100 روپے

ناشر: حنیف انصاری، روم نمبر-4، حاجی منزل، راجپور رول ناکہ، مرزاپور، احمد آباد-380001

زیرِ تبصرہ کتاب ''تحقیق اور تاریخ'' حنیف انصاری کی ادبی قابلیت کا پتہ

دیتی ہے۔ مصنف احمد آباد کے ایک بنکر گھرانے میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے مگر اپنی لگن اور ذوق مطالعہ سے اہل قلم کی صف میں شامل ہو گئے یہی سبب ہے کہ گجرات اردو اکادمی نے کتاب کی اشاعت پر مصنف کو جزوی مالی تعاون ہی فراہم نہیں کیا بلکہ اکادمی کے منتظم پروفیسر محی الدین مبیئ والا صاحب نے مصنف کی حوصلہ افزائی میں یہ جملہ بھی کہا ''انگریزی کتابوں سے سائنس میں بہت ترجمے ہو چکے ہیں مگر کسی اردو ادیب نے آج تک ایسی کتاب کو قلمبند نہیں کیا ہے۔'' مصنف نے اپنی اس تصنیف میں سائنس کو اولیت دی ہے، اس طرح یہ کتاب ایک سائنس، جغرافیائی تاریخی اور دینی معلوماتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید ہے اردو داں ادب نواز جو مطالعے کا ذوق و شوق رکھتے ہیں اس کتاب کو ضرور پسند کریں گے۔

مسافت

شاعر: سعید نعمانی مرادآبادی

صفحات: 144، قیمت:-/200 روپے

ناشر: سعید نعمانی، مغل پورہ اوّل، نزد مسجد اسمٰعیل بیگ، مرادآباد، یو. پی.

دریائے رام گنگا کے کنارے واقع ظروف سازی کے لیے مشہور صنعتی شہر مرادآباد کا نام آتے ہی جگر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ شعر و ادب کے تعلق سے جو شہرت جگر صاحب نے پائی وہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ جگر کی اسی شعری روایت کو آگے بڑھایا ہے سرزمین مرادآباد کے فرزند سعید نعمانی نے۔ زیر تبصرہ کتاب ''مسافت'' سعید نعمانی کا غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ جس کا انتساب شاعر نے وارثی سلسلے سے تعلق رکھنے والے اصغر حسین وارثی کے نام کیا ہے۔ یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ حکومت اتر پردیش کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے، شاعر کے کلام میں ندرت کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں سے ہم آہنگی، جذبات کی وارفتگی واضح طور پر نظر آتی ہے، ان کے کلام میں متاثر کن اشعار کی کمی نہیں ہے۔

□□□

عبدالحلیم شرر — بحیثیت ناول نگار

مصنف: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں مصنف نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے جائزے میں شرر کے حالاتِ زندگی، خاندانی پس منظر، ملازمتوں اور علمی مشاغل، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اوّلین اشاعت جیسے امور سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صفحات: 393، قیمت -/165 روپے

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت:-/457 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

عظیم اقبال

آخری عنایت

اپنی بے مثال فتوحات سے یورپ کے طول و عرض میں تہلکہ مچا دینے کے بعد بدقسمتی سے پسپائی کا بوجھ لے کر ماسکو سے مراجعت کے دوران نپولین بونا پارٹ اپنی فوج سے جدا ہوگیا اور اس نے خود کو ایک ایسے شہر میں پایا جہاں یہودی آباد تھے اور سارا کاروبار انھی کے ہاتھ میں تھا کچھ فاصلے پر چند روسیوں کو آتے دیکھ کر نپولین ایک درزی کی دکان میں داخل ہوگیا اور اس نے التجا کی کہ وہ اسے کہیں چھپا دے۔

درزی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے، لیکن وہ روسیوں سے نالاں اور متنفر تھا، لہٰذا اس نے اس شخص کی مدد کا تہیہ کرلیا۔ اپنی پناہ میں آئے ہوئے آدمی کی دستگیری کو اس نے اپنا فرض بھی سمجھا۔ آناً فاناً اس نے اسے ایک گدّے میں لپیٹا اور گدّا ایک کونے میں کھڑا کر دیا۔ اب اُسے اطمینان تھا۔

روسی فوجی دکان میں گھُسے اور اِدھر اُدھر تاکنے، جھانکنے لگے۔ دُکان کا سامان اُلٹ پلٹ کر لینے کے بعد، ان میں سے ایک نے اپنی تلوار، دو تین بار گدّے میں پیوست کی، لیکن نپولین اپنی خوش بختی سے تلوار کی زد سے محفوظ رہا۔ سپاہیوں کو مایوسی ہوئی۔ انھیں کچھ ہاتھ نہ لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب فوجی چلے گئے تو درزی نے گدّے کو کھول دیا۔ لرزے کی کیفیت میں مبتلا نپولین باہر نکل آیا۔ بڑے جتن سے اس نے اپنے ہوش و حواس بحال کیے۔

''میں تمھارا شکر گزار ہوں، کیونکہ تم نے میری جان بچائی ہے۔'' نپولین نے درزی سے کہا۔ ''میں فرانس کا شہنشاہ ہوں۔ اور میں تمھاری تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ بولو، تمھیں کیا چاہیے؟''

نپولین کے چُپ ہونے پر اس کے روبرو کھڑے شخص کے ہونٹ ہلے۔

''بہت خوب!'' درزی بولا۔ ''میری چھت ٹپکتی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی، اگر آپ اس کی مرمت میں میری مدد فرمائیں۔''

فرماں روائے فرانس کی بھنویں تن گئیں۔

''کیا کسی بہتر چیز کی فرمائش تم نہیں کر سکتے؟'' نپولین نے طیش میں آ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمھاری چھت کی مرمت کرا دونگا، تمھاری اگلی خواہش کیا ہے؟''

سپہ سالارِ اعظم نے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ کے اشارے سے بھی کام لیا۔

''سامنے نکّڑ پر ایک دوسرا درزی رہتا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''وہ میرا کاروبار خراب کر رہا ہے، کیا آپ اسے رضامند کر سکتے ہیں کہ وہ کہیں دفع ہو جائے؟''

درزی کے لہجے سے اس کی بے یقینی عیاں تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' نپولین بولا۔'' ... لیکن تم اتنی ادنیٰ اور معمولی خواہش کیوں کر رہے ہو؟ تم جو چاہو، میں تمھیں دے سکتا ہوں۔''
شہنشاہ کے لیے اپنی جھنجھلاہٹ کی پردہ داری مشکل تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔
''مجھ سے کسی ایسی چیز کی فرمائش کرو، جسے کسی اور سے مانگنے کی تم نے کبھی ہمت نہ کی ہو۔''
یہ سن کر درزی کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے اپنی ساری ہمت مجتمع کی اور بولا۔
''میں یہ جاننا چاہوں گا کہ جب فوجی کی تلوار گدّے میں آپ کو چھوتی ہوئی گزری تو آپ نے کیا محسوس کیا۔''
''بے وقوف!'' نپولین نے گرج کر کہا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔
''تم مجھ سے ایسی باتیں نہیں پوچھ سکتے۔ تمھیں اپنی گستاخی کے لیے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ احمق!''
دریں اثنا، نپولین کے کچھ سپاہی جو اس کی تلاش میں سرگرداں تھے، اس دُکان میں آ گئے۔ نپولین نے انھیں حکم دیا کہ درزی کو باہر لے جا کر گولی سے اُڑا دیں۔

آقائے فرانس کے حکم کی تعمیل میں درزی کو دُکان سے کھینچ کر باہر نکالا گیا اور ایک دیوار کے مقابل کھڑا کر دیا گیا۔ وہ خوف سے لرز رہا تھا۔ وہ رحم کے لیے چیخ رہا تھا کہ اس نے شہنشاہ کو گھوڑے کو ایڑ لگا کر جاتے ہوئے دیکھا۔ ہیبت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔

بے رحم فوجیوں نے نشانہ باندھا اور اپنے حاکم کے اشارے کے منتظر ہوئے کہ گولی چلائیں۔ حاکم کی آواز گونجی۔
''ایک، دو... ت.. ی...''
''رُک جاؤ۔ ٹھہرو، ٹھہرو...''
اس کے عقب سے آواز آئی۔ سب سپاہی پلٹ پڑے۔ انھوں نے دیکھا کہ نپولین کا معتمد خاص سرپٹ دوڑا ہوا ان کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

اس کے دوڑتے، بھاگتے قدموں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی اور ہاتھ بھی اُٹھے تھے۔
''شہنشاہ نے اسے معاف کر دیا ہے!'' وہ بولا۔ ''اُسے چھوڑ دو۔''
ہانپتے ہوئے اس نے اپنی بات پوری کی۔ جیسے ہی لڑکھڑاتے ہوئے درزی نے اپنی دُکان کی جانب قدم بڑھائے، نپولین کے معتمد خاص نے شہنشاہ کی ایک تحریر اُسے دی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے اُسے تھاما۔ اس میں درج تھا۔
''اب تمھیں پتہ چل گیا نہ کہ میں نے کیا محسوس کیا ہوگا!''
اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

□□□

Adabistan Ganj No.I, Bettiah-845438 (Bihar)

ایک رہیں گے

محمد افضال خان

ہم ہیں ہندوستان کے بچّے
دل کے سچّے، قول کے پکّے

نفرت کی دیوار ہٹائیں
پیار کے مل کر نغمے گائیں
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
ایک ہی ڈور میں سب بندھ جائیں

●

وحشت پھیلانے والوں کو
اس دھرتی سے دُور بھگائیں
بستی بستی، قریہ قریہ
امن کا پرچم ہم لہرائیں

●

قوم کے جو سچّے، رہبر ہیں
ان کے آدرشوں کو نبھائیں
ذہن میں ان کی ہی باتیں ہوں
سندیش ان کا سب کو سنائیں

●

ملّا، پنڈت اور فادر کو
ہم سب مل کر یہ سمجھائیں
نیک ہیں ہم سب نیک رہیں گے
ملک کی خاطر ایک رہیں گے

●

4/78, Srinath poral Lane, (Belilious Road)
Ist Floor, Howrah-711101

سب سے آگے

محمد افضل خان

بھارتی بچّو!
جگ میں رہنا سب سے آگے
وِدّیا ساگر سرسیّد، اور اقبال و ٹیگور
علم و ادب کے دیپ جلائے سب نے چاروں اور
بھارتی بچّو!
جگ میں رہنا سب سے آگے
مولانا آزاد، جواہر، باپو اور پرشاد
سب نے دان لہو کا دے کر کیا ہمیں آزاد
بھارتی بچّو!
جگ میں رہنا سب سے آگے
انٹرنیٹ، ای میل سے آگے تم کو اب ہے رہنا
دیش کا جھنڈا اُونچا کرکے اپنی بات ہے کہنا
بھارتی بچّو!
جگ میں رہنا سب سے آگے
فرقہ پرستی کو دینا ہے قدم قدم پر مات
لب پہ نہیں لانا ہے تم کو بھید بھاؤ کی بات
بھارتی بچّو!
جگ میں رہنا سب سے آگے

●

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جا سکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
02	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
03	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
04	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
05	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
06	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
07	چولا راجگان	209.00	52.00
08	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
09	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
10	غرائب الجمل	76.00	19.00
11	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
12	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
13	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
14	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
15	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
16	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
17	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
18	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
19	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
20	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
21	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
22	انسانی ارتقا	70.00	18.00
23	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00
24	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔6-1)	3400.00	850.00
25	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
26	جنت سنگار	180.00	45.00
27	کلیاتِ پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00

28	للّو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
29	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم)	387.00	97.00
	لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)		
30	مجموعۂ نغز	268.00	67.00
31	مسدود راہیں	126.00	32.00
32	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
33	مولیئر	57.00	14.00
34	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
35	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
36	پشکن	60.00	15.00
37	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
38	قدیم ہندوستان میں شُودر	82.00	21.00
39	قومی زبان	76.00	19.00
40	قواعد کیٹلاگ سازی	268.00	67.00
41	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
42	سیرِ کہسار	167.00	42.00
43	طبعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
44	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
45	تنقید عقل محض	158.00	40.00
46	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
47	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
48	تشریحی تصاویر	66.00	17.00
49	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
50	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
51	تالستائے	46.00	11.00
52	اصولِ معاشیات	47.00	12.00
53	اترپردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
54	وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	118.00	30.00
55	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
56	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	2650.00	663.00
57	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
58	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00

59	عکس اور بر عکس	128.00	32.00
60	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
61	دھوپ چولھا	38.00	10.00
62	اجارہ	131.00	33.00
63	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 4	1163.00	291.00
64	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
65	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
66	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
67	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
68	ارتقا کائنات انسان ودیگر مضامین	94.00	24.00
69	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
70	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
71	کائنات جلیل	80.00	20.00
72	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
73	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
74	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
75	پیائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
76	قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی	98.00	25.00
77	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
78	شہیدان آزادی (جلد اول ودوم)	213.00	53.00
79	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
80	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
81	سخنوران گجرات	77.00	19.00
82	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
83	تاریخ آصفی	58.00	15.00
84	اجرتیں	95.00	24.00
85	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
86	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2010 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

قطب مشتری

مصنف:
پروفیسر سید عابد حسین
صفحات:236
قیمت:-/48 روپے

سخنورانِ گجرات

مصنف:
سید ظہیر الدین مدنی
صفحات:344
قیمت:-/77 روپے

قدیم ہندی فلسفہ

مرتبہ:
رائے شیو موہن لعل ماتھر
صفحات:376
قیمت:-/82 روپے

دکنی نثر کا انتخاب

مرتب:
پروفیسر نصیر الدین ہاشمی
صفحات:172
قیمت:-/45 روپے

دکن میں مرثیہ اور عزاداری

مصنف:
ڈاکٹر رشید موسوی
صفحات:316
قیمت:-/17 روپے

کپل کا فلسفہ سانکھیہ

مرتبہ:
کرشن کمار پاٹھک
صفحات:208
قیمت:-/30 روپے

اردو املا
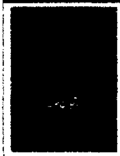
مصنف:
رشید حسن خاں
صفحات:706
قیمت:-/125 روپے

دکنی ہندو اور اردو

مصنف:
پروفیسر نصیر الدین ہاشمی
صفحات:296
قیمت-/111 روپے

ہندی فلسفہ کے عام اصول

مرتبہ:
شیو موہن لعل ماتھر
صفحات:320
قیمت-/18 روپے

شریمد بھگوت گیتا

مصنف:
حسن الدین احمد
صفحات:120
قیمت-/38 روپے

سُورداس کے روحانی نغمے
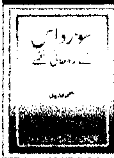
مصنف:
جعفر رضا زیدی
صفحات:263
قیمت-/91 روپے

تاریخ ہندی فلسفہ جلد اوّل
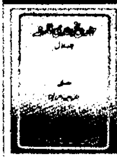
مصنف:
ایس این داس گپتا
صفحات:574
قیمت-/89 روپے

اردو کی کہانی
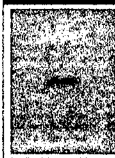
مصنف:
سید احتشام حسین
صفحات:104
قیمت-/32 روپے

تذکرہ گلشن ہند
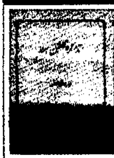
مصنف:
میرزا علی لطف
صفحات:208
قیمت-/90 روپے

دل کی گیتا
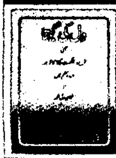
مرتب:
مخمور سعیدی
صفحات:240
قیمت-/92 روپے

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2009-11
Date of Publication 24/01/2010
Date of Dispatch 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, February 2010, Vol. 12, Issue: 2
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education Ministry of H.R.D., Government of India

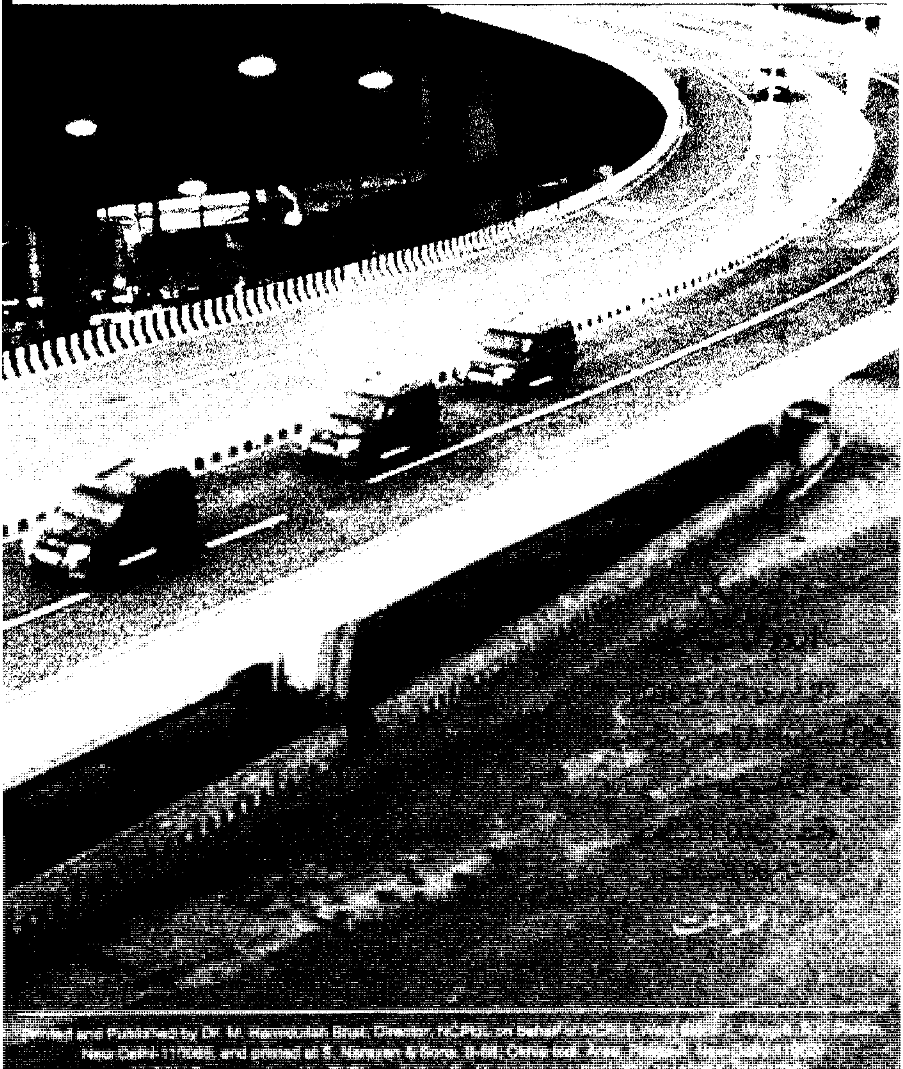

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL [illegible]
New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Ind. Area, Phase-II, New Delhi-110020
on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat [illegible]